

ہم بھی کیسے پاگل تھے

مدیہ نسیم

”سامعین اب ہم آپ کا تعارف کرواتے ہیں“ نعمت کدہ“ کے افراد سے، حالانکہ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اس کا نام نعمت کدہ کی بجائے حیرت کدہ ہوتا تو زیادہ بہتر رہتا کیونکہ یہاں آنے کے بعد ہر انسان کم از کم ایک دفعہ تو ضرور حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن ہمارے تایا ابا بڑے شکر گزار انسان ہیں اور اللہ کے شکرانے کے طور پر انہوں نے اس گھر کا نام نعمت کدہ رکھا ہے شکر ہے کہیں ”شکر یہ کدہ“ نہیں رکھ دیا۔“

تو اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف۔

ناولٹ

ہیں اور خود کو تصور میں ابن صفی خیال کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ لاؤنج کے آخری کنارے یہ بیٹھی اپنے بالوں میں نجانے کون کون سی ابلاتھوئے والی ”صبا“ ہے۔ جو ساری عمر اپنے بالوں کو لمبا کرنے کی کوشش میں لگی رہے گی اور یقیناً ناکام ہی رہے گی۔ اس کے باوجود وہ خود کو ”باد صبا“ کہتی ہیں لیکن ہیں وہ بادِ سموم! یہ بھی بڑے تایا ابا کی بیٹی ہیں اور ان ہی کی طرح جلائی ہے۔

اور ڈائجسٹ میں پوری طرف ڈوبی اپنے آپ سے یکسر لاپرواہ کاؤنچ یہ ہی دھرنامار ہے بیٹھی ”رومی“ ہے۔ بظاہر یہ بالکل پرسکون نظر آتی ہیں۔ بحیرہ روم کی طرح لیکن اندر سے پوری ہلکے ہیں شاہ روم کی طرح۔



”ہاں جھوٹ بولنے میں تو تم نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔“ رومی جو ڈائجسٹ پوری طرح چاٹ چکا تھی اسے ایک طرف رکھ کر طنز یہ لہجے میں بولی۔

”تو تم خود کون سا کسی سے کم ہو، جھوٹوں کی نانی۔“ زین کیوں کسی سے پیچھے رہتا۔
”اے کر تو توں کا چہ ہے ناں؟“ رومی نے کڑے تیروں سے اسے چھوڑا۔

”لہذا اپنی زبان بند رکھو ورنہ سارا کچا چھٹا کھول دوں گی۔“ اس کی دھمکی کافی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ زین برا سامنے بنا کر چپ ہو گیا۔

پوریج میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو ان سب میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ تایا ابا کا مخصوص بارن وہ سب پہچانتے تھے۔

سب سے پہلے صبا اٹھی تھی اور اپنے مہندی لٹھڑے بالوں سمیت واش روم میں گھس گئی۔ رومی ڈائجسٹ صوفے کے نیچے کھسکا کر یکن میں بھاگ گئی۔ یعنی نے اپنی کتاب بچل میں دہائی اور اوپر کی طرف بھاگی۔ زین سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے میزچیوں کی طرف لپکا لیکن جاتے وقت وہ ڈریو پھری مورکا بوسٹر اتارنا نہیں بھولا تھا۔ شہزاد کو اور کوئی جگہ نہ ملی تو اپنے گٹار سمیت گیٹ روم میں گھس گیا۔ واحد علی ہے لاؤنج میں باقی بچا تھا اور اس خاندان کا وہ واحد لڑکا تھا جو ڈٹ کر پڑھنے کے بعد اب بزنس میں دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ لہذا اسے ڈانٹ پڑنے کے چانسز کم ہی تھے۔

”ہائے میرے اللہ! تیرا خانہ خراب ہو صوفی کے نیچے۔“ اپنے سفید لمبل کے دوپٹے کا خشر دیکھ کر حسرت پیچھے نے ہائی غصے سے جی کو ٹھوڑا۔

”اف بڑی امی! میرے نیچے کہاں سے آ گئے میں تو ابھی خود بچہ ہوں۔“ حسرتی نے بے اختیار اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔

”نیچے کے دادے! پہلے یہ بتا کہ تو میرا دوپٹہ کیوں لے کر گیا تجھے تو رومی نے دوسرا دوپٹہ دیا تھا۔“ واقعی صبح رومی نے اسے اپنا دوپٹہ ڈانی کرنے کے لئے دیا تھا۔ اب شوٹی قسمت کہ جس ٹیبل پر وہ دوپٹہ رکھ گئی اس ٹیبل پر بڑی امی کا دوپٹہ بھی پڑا تھا۔ جو پچھلے دنوں تمہینہ خالہ سعودیہ سے لائی تھیں اور انہیں بہت پسند تھا۔

”بڑی امی! ابھی تو میں باپ بننے کی حسرت دل میں دیا ہوں گھوم رہا ہوں اور آپ نے مجھے دادا بنا دیا۔ چلیں اللہ آپ کی دعائیں پوری کرے۔“ حسرتی نے نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔

”کس کی دعائیں پوری ہو رہی ہیں۔“ علی نے اسی وقت اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں ہوئیں مستقبل قریب میں شاید ہو جائیں۔“ بڑی امی کی متوقع ڈانٹ سے نیچے کی خاطر حسرتی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔

”اسے تو عادت ہے انہی سیدھی باتوں کی تم بتاؤ بکرا لینے گئے تھے ملا نہیں کیا؟“ حسرتی کی پشت کو حسرتی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ علی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”کیا بتاؤں امی جان! ایک تو عید میں اتنے کم دن رہ گئے ہیں سورش بھی بہت زیادہ تھا۔ پھر ابو جی کو بھی کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔

چنانچہ ابو جی ادھر چلے گئے اور میں گھر آ گیا۔ اب شام تو زین اور حسرتی کو ساتھ لے جاؤں گا پھر لے آؤں گا کوئی بکرا یا گاے۔ جو بھی پسند جائے۔“

پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے اس نے تفصیل بتائی۔

”علی! آج پھر بکرا نہیں لے کر آئے تم۔ کتنے دنوں سے مڑخارے ہو۔“ دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھول کر حسرتی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”اتنا بڑا ہے تم سے۔ شرم نہیں آتی منہ بھاڑ کر علی کہتے ہوئے۔ بھائی کہتے ہوئے منہ دکھتا ہے تمہارا۔“ بڑی امی کے لڑنے پر وہ بولھلا گئی۔

”مم..... میرا مطلب یہی تھا کہ علی یعنی علی بھائی۔“ بولھلاہٹ میں وہ بے ترتیب سے لفظ بول گئی۔ علی نے اختیار مسکرا دیا۔

”یعنی! کھانا تو لا دو بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ جانتا تھا امی جان اتنی جلدی اسے نہیں چھوڑنے والی لہذا خود ہی اسے وہاں سے بھا دیا۔

”زین بھائی! دوپہر میں کھانا کھانے کے بعد پھر بھوک لگ گئی ہے؟“ وہ یکن میں داخل ہوئی تو زین کو ٹرانزٹل سے انصاف کرتے دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

”یہ زین بھائی کس کو کہا ہے؟“ حلق سے نیچے اترتا ٹرانزٹل کو نمین سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا اسے نے تمللا کر مینی کو دیکھا۔

”اب تمہاری وجہ سے ڈانٹ کھاؤں پہلے ہی علی بھائی کی وجہ.....“

”یہ تمہیں آج بھائی چارے کا دورہ پڑا ہوا ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر غصے سے بولا۔

”بڑی امی نے کہا ہے جو تم سے بڑا ہوا ہے بھائی کہا کرو۔“ اس نے بردباری سے بتایا۔

”اچھا مجھے ایک بات بتاؤ۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تمہارا شوہر تم سے بڑا ہوا تو تم اسے بھی بھائی کہو گی؟“

”ہاں تو پھر.....“ وہ بے دھیانی سے سر ہلانے لگی پھر سمجھ آنے پر ایک دم چلا اٹھی۔

وہ سب عید کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ چچی جان جو کہ مقامی کالج میں پیکر تھیں کپڑوں کی ڈیزائننگ نہایت غصب کی کر لی تھیں جب کہ چھوٹی نانی امی نہایت مہارت سے سلائی کرتی تھیں۔ اب بھی وہ دونوں پوری طرح متنبہ تھیں۔ رومی ان کے پاس بیٹھی اپنے مشوروں سے نواز رہی تھی۔ کیونکہ اسی کا عید کا ڈریس انڈر پروڈکشن تھا۔

”رومی! میرا واپس سوٹ بریس کر دو۔ ہم نے ابھی بکرا منڈی جانا ہے۔“ علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے حکم صادر کیا۔ وہ جھنجھلا گئی۔ اگر امی جان نہ ہوتیں تو یقیناً کوئی کرارا سا جواب ضرور دیتی۔ لہذا اسے حسرتی نظروں سے گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔ وہ چند لمبے ادھر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر اس کے پاس چل دیا کہ اس کے بغیر ادھر بیٹھ کر کیا کرتا؟

”بکرا منڈی تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے امریکہ جانا ہو۔ نواب زادہ! سلوٹ زدہ کپڑوں میں تو جیسے اسی کسی نے بکرا ہی نہیں دینا۔ ہونہ۔ بکرا لینے جانا ہے یا رشتہ مانگنے۔“ وہ مسلسل بڑبڑاتے ہوئے اس کا سوٹ بریس کر رہی تھی۔

”یہ تم میرا کام کرتے وقت اتنی باتیں کیوں کرتی ہو؟“ اس کی جھنجھلاہٹ کو انجوائے کرتے ہوئے وہ خاصی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”اور تم نے اپنا ہر کام مجھ سے ہی کیوں کروانا ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں یا میرے علاوہ کسی اور کا نام لیتے ہوئے زبان میں لکنت آ جاتی ہے۔“ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

”وہ کیا کہتے ہیں کہ جو بات تم میں ہے وہ کسی اور میں کہا۔“ اس کا اندازہ سراسر چھڑانے والا تھا اور وہ تو پہلے ہی چڑی بیٹھی تھی۔

”اب اگر تم نے کوئی بکواس کی تو میں یہ آئرن اسٹینڈ سمیت ہر چیز تم پر الٹ دوں گی۔“

وہ جارحانہ لہجے میں بولی تو علی بے ساختہ مسکرا دیا۔

”تایا ابا! میرا خیال ہے کہ پہلے ہی کسی قصائی سے ٹائم لے لیتے ہیں، کیونکہ وقت یہ نہ تو کوئی قصائی ملتا ہے اور نہ ہی قصاب۔“ صفی اپنی طرف سے بڑی بردباری کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے تایا ابا کو مشورے سے نواز رہا تھا۔
وہ سب اس وقت دسترخوان بچھائے رات کے کھانے میں مشغول تھے۔

”نہ تو برخودار! تم نے ہاتھ میں چوڑیاں ڈال رکھی ہیں۔“ تایا ابا نے اسے سخت نظروں سے گھورا تو صفی نے بے اختیار اپنی دونوں کلائیوں کو دیکھا۔

”نہیں تایا ابا! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ چوڑیاں جو کل آپ نے میرے پاس دیکھی تھیں وہ اپنے لئے نہیں لایا تھا میں بلکہ وہ تو عینی کے لئے لایا تھا۔“ اس کی بات پر رومی، عینی اور صبا کے چہروں پر دلی ہونی مسکراہٹ پھیل گئی۔
”میں تمہاری طرح احتیاط سوچ نہیں رکھتا گدھے!“ صفی کی قسمت خراب تھی کہ اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے۔

”اور یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ قربانی کے لئے کسی قصاب کو بلوانا ہے؟ تم اتنے لوفروں کا کیا فائدہ اگر ایک گائے نہیں ذبح کر سکتے اور تو بھی کوئی نیکی کا کام کیا نہیں کم از کم سال بعد ہی نیکی کما لیا کرو۔“ تایا ابا پورے جلال میں آچکے تھے اور اب کم و بیش ان سب کو ثواب اور اجر کے عنوان کے تحت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سیر حاصل گفتگو سنی تھی لہذا وہ سب ہی سرنبوڑے بیٹھے تھے اور صفی اس وقت کوکوں رہا تھا جب تایا ابا کے سامنے اس کی زبان پھسکی تھی۔

”رومی! مجھے مہندی لگا دو۔“ عینی نے رومی

کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں فارغ نہیں ہوں صبا ہے کہو۔“ وہ اپنے دوپٹے میں ستارے ٹانگ رہی تھی جو اسے صبح پہننا تھا لہذا اس نے کورا جواب دے دیا۔

”صبا! مجھے مہندی لگا دو۔“ وہ مہندی کی کون اٹھائے اب صبا کے پاس آگئی۔

”یعنی! کپڑے پر پس کرنے لگی ہوں۔ اتنا ڈھیر ہے کپڑوں کا مہیں مہندی لگانے بیٹھ گئی تو وہ کون پر پس کرے گا۔“ اس کے جواب پر عینی کا منہ لٹک گیا۔

”میں گائے کو مہندی لگا آیا ہوں بلکہ رنگ برنگی پٹیاں بھی باندھ کر آیا ہوں۔“ شہزاد نے اندر داخل ہوتے ہوئے ایسے فاتحانہ انداز میں کہا جیسے مسئلہ شہر حل کر آیا ہو۔

”مبارک ہو، یہ بیوی آپ کو بطور ایوارڈ پیش کیا جاتا ہے۔“ علی نے بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شہزاد مشکور سی مسکراہٹ سمیت پاس پڑے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہے تمہارے پاس۔“ علی کوکل میں نے اتنی دفعہ کہا تھا ہمارے لئے چوڑیاں لے آئے جال ہے جو اس کے کان پہ جوں تک رہی تھی ہو۔“ رومی نے علی کو گھورتے ہوئے کہا تو مسکراہٹ خود بخود ہی اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”تم کہو تو چوڑیوں کا پورا اشال ڈھیر کروا دوں تمہارے آگے۔“

”ہاں بس ڈائلاگ بولنے آتے ہیں تمہیں۔“ وہ کام سے فارغ ہو چکی تھی لہذا دوپٹہ ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

”بھئی مجھ سے جس نے ناراض ہونا ہے شوق سے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ صفی نے صوفے پر ہی دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح عیدی دینے سے بچ جاؤ گے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ استری

کا پلنگ لگاتے ہوئے صبا نے کہا۔

”یعنی! تمہارے چاچو چائے مانگ رہے ہیں۔“ چچی جان نے یکن میں سے آواز لگائی۔ وہ انہوں خواہیں صبح کے لئے لوازمات تیار کر رہی تھیں۔

”اس لئے کہہ رہی تھی کہ مجھے مہندی لگا دو۔“ عینی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی۔

”ایک کپ میرے لئے بھی۔“ ان سب نے ایک ساتھ کہا یعنی تملکلا کر مڑی اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر سب کو ہنسی آگئی چند سیکنڈ انہیں گھورنے کے بعد وہ خود بھی ہنسنے لگی۔

سارے مردوں کے عید گاہ جانے کے بعد ان سب نے مل کر سارا پھیلاوا سمیٹا اور جلدی سے تیار بھی ہو گئیں۔ ان کے واپس آتے ہی وہ عیدی لینے کے لئے ان کے سر ہو گئیں۔ بڑے نمایاں چھوٹے تایا اور چچا جان تھے عیدی لینے کے بعد لڑکوں سے عیدی مانگنے لگیں جو غربت کا رونا کر اپنی جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔

”آج کے دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔“ عینی نے طریت سے ہماری عیدی نکالو۔“ رومی نے دھونس بھرے لہجے میں علی سے کہا۔ آف ان سوٹ جس پر خوبصورتی کے ساتھ مٹی شیز کا کام کیا گیا تھا زیب تن کیے بالوں کی ڈھیلی سی بنائے، لائٹ سے میک اپ میں وہ اتنی کی لگ رہی تھی کہ علی بے اختیار ہی اسے دیکھے

”گھورے کیا جا رہے ہو عید نکالو۔“ وہ

”بھئی شرمنا بھی لیا کرو۔“ اس نے گویا

”مجھ یہ کون سی آفت آن پڑی ہے کہ تم شرمنا پھرو۔“ اس نے بے نیازی سے

”بھئی سیدھی سی بات ہے میں تو نہایت کنگال ہوں لہذا مجھ سے قطعی امید نہ رکھی جائے۔“ صفی نے صاف دامن بچانا چاہا۔
”میں بھی۔“ شہزاد بھی اس کا ہم نوا بن گیا۔

”عیدی تو ہم نے لینی ہے چاہے اینا گٹار بچ کے دو۔“ وہ کہاں معاف کرنے والی تھیں۔ انہوں نے جان چھڑانا چاہی لیکن وہ بھی بڑی کانیاں تھیں۔ عیدی لے کر ہی چھوڑ دی۔
”زین اچھا رہ گیا جو پہلے ہی چلا گیا۔“ صفی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ زین دو دن پہلے ہی اپنے گھر گیا تھا۔

”صبا! یہ گاجر کا حلوہ تو ذرا سندس کو دے آؤ۔“ چچی جان نے اسے ڈش بکراتے ہوئے کہا۔ سندس ان کے برابر میں اپنے دو بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھی صبا کی اس سے کافی دوستی تھی۔ چچی جان سے ڈش پکڑ کے وہ سندس آپنی کے گھر آگئی۔

اؤنج کا دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ کیونکہ پچھلے تقریباً دو سال سے اس کا سندس آپنی کے گھر کافی آنا جانا تھا لیکن ان کے گھر اس نے بھی ایسے نیک لڑکے کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر غائبانہ بھی حیران ہوا تھا۔

”آئیے، آئیے آخر کسی کو تو ہمارا خیال آیا میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہاں کے بڑوسی کتنے بے مروت ہیں۔“ صبح سے کسی نے یہاں جھانکا بھی نہیں۔“ وہ نہایت خوشدلی سے بولا۔

”کون ہیں آپ؟“ صبا نے نہایت مشکوک نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ براؤن کھدر کا سوٹ پہنے، پاؤں میں گھریلو سادہ سے سیلر، سلیقے سے چھائے کئے بال اور شکل صورت بھی ٹھیک ٹھاک تھی، شکل سے تو چوراچکا نہیں لگتا۔ اس نے

سوچا۔ ”میں تیسور ہوں۔“ اس کا انداز ایسے تھا جیسے کہہ رہا ہو میں جارج ڈبلیو بش ہوں۔ ”میری بلا سے تیسور ہوں۔ سندس آپ کی کہاں ہیں؟“ اس نے ہنسنے لگا۔ ”خبردار اگر اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تو میں ٹریگر دبا دوں گا۔“ اس نے نہایت سرعت سے اپنی جیب سے پستل نکال کر سرد لہجے میں کہا۔ ”صبا کی تو گویا جان نکل گئی۔“

”یہاں موجود ایک مرد اور خاتون کو میں نے بے ہوش کر کے اوپر کمرے میں ڈال دیا ہے اور اب تمہاری باری ہے۔“ اس کے ہاتھ سے ڈش پکڑ کر میز پر رکھتے ہوئے وہ نہایت سفاکی سے بولا۔

صبا نے اپنی پوری قوت جمع کر کے چیخا۔ ”خبردار! اگر چلائی تو کھوپڑی میں پتھر کر دوں گا، چپ چاپ اوپر میرے ساتھ چلو۔“

بایاں ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر اس نے بے لک لہجے میں کہا۔ ”صبا تمہارے کانپنے لگی۔“

”میرا آخری وقت آگیا۔“ اس نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ ساری نحوست رات کو عشاء کی نماز نہ پڑھنے کی ہے یا اللہ ایک دفعہ معاف کر دے آئندہ سے ہر روز پڑھوں گی۔“

”تیسور! یہ کیا کر رہے ہو؟“ اسے سندس آپ کی آواز سنائی دی تو جھٹ آنکھیں کھول دیں۔

”آپی! آپ کی مہمان بہت ڈر پوک ہے۔“

”جزہ کی نقلی پستل سے ڈر گئی۔“ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ سندس آپ کی اسے گھورتے ہوئے صبا کی طرف بڑھیں۔

”اس کی باتوں کا برا مت ماننا صبا! یہ ہے ہی بیوقوف!“ وہ صبا کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر

”اب کب آئیں گی آپ۔“ وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔

”جب آپ یہاں سے دفغان ہو جائیں گے۔“ وہ بغیر کسی لحاظ کے بولی تیسور مسکرا دیا۔

”آپ کہیں تو میں یہیں رک جاتا ہوں۔“

”کیوں میرا دماغ خراب ہے جو میں آپ سے کہوں۔“ وہ غصے سے بل کھا کر مڑی۔

”غصے میں اچھی لگتی ہو۔“ وہ گہری مسکراہٹ سمیت سے بولا۔ صبا جڑ بڑھ کر رہ گئی۔

”مرحہ اللہ کرے!“ دل میں کہتے ہوئے اس نے گیٹ کھولا۔

”صبا! ایک منٹ۔“ اس نے پیچھے سے پکارا تو وہ تلملا کر مڑی۔

”عید مبارک۔“ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا مڑ گیا۔ جب کہ وہ سرخ چہرہ لیے ”نعت کدہ“ میں گھس گئی۔

”اف اللہ! کتنا مزہ آئے گا مجھے بہت شوق ہے مری دیکھنے کا۔“ عینی جوش سے بولی۔ چچی بان کا کاج آٹھ دن کے لئے مری جارہا تھا۔ انہوں نے ان تینوں سے بھی چلنے کو کہا تو وہ خوش ہو گئیں اور اب نہایت جوش سے پروگرام مرتب کر رہی تھیں۔

”تو اور کیا، ایک دفعہ پہلے گئے تھے اس وقت تو ہم اتنے چھوٹے تھے کچھ یاد ہی نہیں، اب تو خوب انجوائے کریں گے۔“ صبا نے بھی اپنی رائے بیان کی۔

”رومی! جلدی سے کھانا دے دو بہت سوک لگ رہی ہے۔“ علی اسے کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر جب تک وہ فریش ہو کر باہر روئی کھانا گرم کر چکی تھی۔

”آج آرزو میں کھانا نہیں کھاتے تم، دیکھو تو ہم چار بج رہے ہیں۔“ ہاٹ پاٹ ٹیبل پر رکھتے

ہوئے وہ علی سے مخاطب ہوئی تھی۔

”آج ایک ضروری مینٹنگ تھی حسن ٹریڈرز کے ساتھ کچھ اس میں دیر لگ گئی اوپر سے راستے میں ٹریفک جھنسی ہوئی تھی۔ میرا تو بھوک سے حشر ہو گیا۔“ نہایت رغبت سے کھاتے ہوئے وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا۔

”شہزاد تو چلو ابھی پڑھ رہا ہے یہ صفی ہر وقت پھرتا رہتا ہے اسے لگاؤ ناں اپنے ساتھ۔“ علی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ فکر مندی سے بولی۔

”تم میرے لئے پریشان ہو مجھے اتنا ہی بڑا ہے۔“ بانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے اس نے کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”تمہیں پتہ ہے علی! ہم چچی جان کے ساتھ ایک ہفتے کے ٹرپ پہ جارہے ہیں فری۔ قسم سے بڑا مزہ آئے گا۔“ وہ جیسے تصور میں ہی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ نوالہ علی کے حلق میں اٹکنے لگا۔

”ایک ہفتہ؟“

”تم بھی جا رہی ہو؟“ اس کے پوچھنے پر اس نے بڑی خوشی خوشی سے اسے اپنا پان بنایا۔

”وہ کچھ دیر جا چکی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔“

”تم نے مری کیا کرنے جانا ہے بیٹی رہو آرام سے کر۔“ وہ کھانا کھا چکا تھا لہذا نیکین سے ہاتھ صاف کرتا کھڑا ہو گیا۔

”میں کیوں بیٹھی رہوں، میں جاؤں گی۔“

اسے غصہ ہی تو آگیا ہر وقت مجھ پر حکم چلاتا رہتا ہے۔ سمجھتا کیا ہے خود کو وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

”ضد نہیں کرتے رومی! میں نے کہہ دیا ناں بس۔“ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتا وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی غصے سے کھولتی اس کے پیچھے چلی آئی۔

”میرے جانے سے تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

”مجھے تکلیف ہے بانیس، بہر حال تم کہیں نہیں جا رہی۔“ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے حتمی

لہجے میں کیا۔

”تم ہو علی میری خوشیوں کے قاتل! تم سے میری خوشی دیکھی ہی نہیں جاتی علی!“ غصے سے چلائی وہ دھاڑ سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ علی نے بے اختیار اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھوسیں۔ پھر اطمینان سے مسکرا دیا۔

”مجھے سے زیادہ تمہاری خوشیوں کا امین کون ہو گا رومی ڈیر!“

اور پھر ہوا وہی تھا جو اس نے کہہ دیا نجانے اس نے کون سی رات کی تھی کہ بڑی امی تو ایک طرف اس کی اپنی امی کے جانے پہ راضی نہیں تھی۔ صبا اور عینی البتہ اس تھیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ خوب جی بھر کے روئی تھی اور علی سے تو اس نے بالکل ہی بات نہیں کی تھی۔

”تین افراد گھر سے کیا گئے ہیں گھر تو بالکل خالی خالی لگنے لگا ہے۔“ وہ لان میں پودوں کو پانی لگا رہی تھی۔ صفی اور زین اس کے پیچھے کین کی کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ شبنم ادا کیڈی گیا ہوا تھا۔ جب کہ علی ابھی آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ بڑوس میں فوننگی ہو گئی تھی بڑی امی ادھر گئی ہوئی تھیں جب کہ امی جان سبزی بنا رہی تھیں۔

”تو اور کیا اور پیٹیاں تو ویسے بھی پرایا دھن ہوتی ہیں۔“ امی جان نے ٹھنڈی ساس بھرتے ہوئے کہا۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے امی جان! اتنے لاڈ سے ہم اپنی بہنوں، بیٹیوں کی پرورش کرتے ہیں اور کتنے آرام سے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔“ صفی کے لہجے میں کمی چل گئی۔ رومی کا اپنا دل بھر آیا۔ اس نے کب سوچا تھا وہ اپنا اپنا پیارا گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

”رومی! ادھر آؤ میرے پاس۔“ صفی نے اسے رکارا تو وہ خاموشی سے چلتی اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر ایک دم ہی اسے پتہ نہیں کیا ہوا تھا اس کے گلے لگ کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”رومی! چندا کیا ہوا؟“ وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی صفی!“ وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ صفی کی آنکھیں بھر آئیں۔ امی جان بھی آبدیدہ ہو گئیں۔

”خیر بہت تو ہے کیا ہوا؟“ علی ابھی آیا تھا ان سب کی شکلیں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ رومی ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور اندر چلی گئی۔ اس کی حرکت پر متعجب ہوتا وہ پوچھنے لگا۔ امی جان اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے بتانے لگیں۔

”تو کون کہہ رہا ہے اسے یہاں سے جانے کے لئے۔“ خواجواہ آپ سب ممکن ہو رہے ہیں۔“ اس نے جیسے ان سب پہ افسوس کیا۔

”لگتا۔“ امی جان مسکرا دیں۔

”بھئی بیٹیوں کو بھی کسی نے گھر بٹھایا ہے آج یا کل انہیں رخصت تو کرنا ہی ہے۔“ ان کا لہجہ پھر بھگنے لگا۔

”تم دونوں سے ایک لڑکی نہیں چپ کروائی گئی، تف ہے تم پر۔“ صفی اور زین کو افسوس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”جس رفتار سے پچھلے تین دنوں سے رہ رہی ہو اگر اسی طرح روتی رہی تو بالکل ہی ختم ہو جاؤ گی پھر کوئی یا بنے بھی نہیں آئے گا۔“ وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔

”فکر نہ کرو تمہاری منتیں نہیں کروں گی۔“ وہ تڑخ کر بولی سارا رونا دھونا تو ٹور پہ نہ جانے کی وجہ سے تھا اور یہ سارا کیا دھرا ابھی علی کا تھا۔

”تمہاری منتوں کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رومی نے جواب دینا گوارا نہ کیا۔ سامنے پڑا میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ غصہ کس بات ہے؟“ اس نے نہایت دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

جواب اس نے کہا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”دیکھو رومی! ہمیشہ اپنے مفاد کے لئے نہیں سوچنا چاہیے۔ بلکہ ہماری سوچ سب کے لئے یکساں ہونی چاہیے۔ مجھے معلوم ہے تمہیں غصہ کس بات کا ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچو تمہیں روکنے کا کوئی نہ کوئی ٹھکر تو ہو گا۔“ اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔

”تم خود سوچو تم سب کے چلے جانے سے یہاں کتنی ڈسٹرینس ہونی تھی۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا گھر ہے اور اتنے زیادہ افراد۔ اب امی جان اور چھوٹی امی میں اتنا استیثنا نہیں ہے کہ وہ اتنا کام کر سکیں۔ صرف اپنی انجوائے منٹ کی خاطر انہیں تکلیف میں ڈالنا تمہیں گوارا ہے؟“ اس نے رک ٹر پوچھا تو رومی کا سر بے اختیار لفٹی میں ہل گیا۔

”اب دیکھو جو تم نے آٹھ دن کے ٹور کی قربانی دی ہے تو اس کے بدلے میں سب کے دلوں میں تمہاری قدر کتنی بڑھ گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم چلی بھی جالی تب بھی تمہارا دل یہیں اٹکا رہنا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے بھی تمہیں سب کی فکر دینی تھی۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم یہیں رہ کر سب کی فکر کرو۔“ اس کی باتوں سے وہ واقعی قائل ہو گئی تھی۔ اس پہلو پر اس نے واقعی نہیں سوچا تھا۔

”لیکن علی! یہ بات تم صبا اور عینی سے بھی کہہ سکتے تھے لیکن تم ہر بات میں مجھے ہی گھسیٹتے ہو۔“ وہ منہ بنا کر بولی تو علی بننے لگا۔

”چلو اب تم ایک دفعہ ہی چلی جانا۔ میں تمہارے شوہر سے کہوں گا ہماری رومی کو مری دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ لہذا اس کی یہ خواہش ضرور پوری کرنا۔“ اس کی بات پر وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”اب ایسی بھی بات نہیں۔“

”پھر کیسی بات ہے؟“ وہ دہرہ بولا۔
”اگر یہ ساری تقریر تم پہلے ہی کر لیتے تو کم از کم مجھے اتنا رونا تو نہ پڑتا۔“ اس نے خفگی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم کافی عقلمند ہو لیکن اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تمہارا اپرچیمر بالکل خالی ہے۔“ اس کا انداز شرارتی تھا۔

”ہاں تمہارا اپرچیمر تو جیسے قل سے ناں۔“ وہ کون سا کسی سے کم تھی۔ ویسے بھی علی کی باتوں سے وہ کافی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔
”بالکل۔“ وہ مسکرایا۔

”اور ڈنر کے بعد تیار رہنا آئس کریم کھانے چلیں گے۔“ اس کی بات پر وہ خوش ہو گئی۔

”علی! تم کتنے اچھے ہو۔“

”اور اس دن کیا کہہ رہی تھی، تم تو میری خوشیوں کے قاتل ہو۔“ اس نے ہو بہو اس کی نقل اتاری۔

”اچھا! اب شرمندہ تو مت کرو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس کھڑا ہوتا دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھا۔

”رات کا کھانا میرے فرشتوں نے نہیں بنانا، مجھے ہی بنانا ہے۔“ مڑے بغیر کہتی وہ باہر نکل گئی اور کھانا بناتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

”علی واقعی اچھا ہے میں خواجہ اسے برا بھلا کہتی رہی۔“

چچی جان وغیرہ کا ٹرپ واپس آچکا تھا۔ چند دن تو وہ خوب زور و شور سے اسے اپنی روداد سناتی رہیں پھر وہی گئی بندھی روٹین۔

”یار! ہم لوگ کتنے بور ہیں۔“ صبا نے ایک لمبی سی جمائی لیتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں اس وقت سنگ روم میں آڑھی ترچھی لیٹی تھیں۔

”کیوں، یہ تمہیں یکا یک بوریٹ کیوں ستانے لگی۔“ رومی نے تھوڑا متعجب ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”دیکھو ناں! اتنا بڑا گھر ہے ہمارا اور اتنی ساری جوان جہان اولاد۔ لیکن ہماری ماؤں کو ذرا بھی پرواہ نہیں، چلو شادی نہ ہی کم از کم ایک آدھ کی تو پہنچنی کر دیں۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے سب کی فکر اس کی ہوتی ہو۔

”اوجھلا مٹھنی کروانے کا کیا فائدہ؟“ عینی نے برا سامنہ بنایا۔

”فائدہ تو بڑے ہیں لیکن فی الحال میرا دل کر رہا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی منشن ہو۔ تھوڑا ہلکا گا ہو۔ ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں اگر رومی مان جائے تو؟“ صبا نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہاری اور علی کی مٹھنی کر دیتے ہیں اور بقرہ عید پر رخصتی۔“ کو کیسا زبردست آئیڈیا ہے۔“ اس نے داد طلب نظروں سے رومی کو دیکھا۔

”صبا کی بچی!“ اس نے پاس پڑا کٹنن اسے دے مارا جسے نہایت سہولت سے صبا نے پیچ کر لیا۔ عینی زور زور سے ہنسنے لگی۔

”جھلا کیا کی ہے میرے بھائی میں؟ اور تمہیں تو ویسے بھی خوب پریکٹس ہوئی ہے وہ اپنے ہر کام کے لئے تمہیں ہی آوازیں دیتا ہے بعد میں اور آسانی ہو جائے گی۔“ وہ اپنی رومیوں بولے جا رہی تھی۔

”برابر والوں کے بڑے بیٹے سے جو سنار ہے۔ خوب سونا پہنانیں گے تمہیں۔“ جواب اس نے بدلہ اتارا تھا۔

”اے دفعہ کرو اس کالے کو، یہ اپنی سندس آپی ہیں ناں اس کے بھائی سے بھی ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی قسم سے بندہ بڑا بینڈم ہے۔“ صبا نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا رومی

اس کے انداز پہ سلگ گئی۔

”ملاقات؟“ عینی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”آفاق ملاقات کہیں کوئی اور مطلب نہ لے لینا۔“ اس نے تصحیح کی۔ پھر اس سے پہلے کہ رومی مزید کوئی سوال کرنی ٹیلیفون کی تیز بیل نے ان تینوں کو ڈسٹر ب کیا تھا۔ وہ تینوں ٹیلیفون سیٹ کو کھور کر رہ گئیں۔ لیکن ازلی کا بلی کی بناء پر کسی نے اٹھ کر اسے سننا گوارا نہیں کیا۔

”گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟“ تایا ابا شاید ابھی آئے تھے پھر اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی فون ریو کر نی تایا ابا لاؤنج میں پڑے سیٹ کار ریو اٹھا چکے تھے۔

دوسری طرف خدیجہ تھیں ان کی اکلوتی پھپھو، جو امریکہ میں رہتی تھیں۔ پل بھر میں سارا گھر اکٹھا ہو گیا تھا۔ کیونکہ پھپھو جب تک خود ہر ایک سے بات نہ کر لیتی ان کو چین پڑتا تھا۔ سب سے بات کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ تایا ابا سے بات کی تھی۔

”بھائی جان! میں ہمایوں کو پاکستان بھیج رہی ہوں۔“

”ارے ہمایوں کا اپنا گھر ہے یہاں وہ جب مرضی آئے۔“ تایا ابا کی بات پر ان سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

”وہ تو ٹھیک سے بھائی جان! لیکن آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟“ خدیجہ پھپھو نے تصدیق چاہتی تھی۔

”مجھے بالکل یاد ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ آ جاؤ اور اپنی امانت لے جاؤ۔“ تایا ابا نہایت خوشدلی سے بولے تو ان سب کے دل دھڑک اٹھے نجانے وہ کون سی ”امانت“ کی بات کر رہے تھے۔

”مجھے تو آنے یہ کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو آج کل کی نئی ٹیکس کا تو پتہ ہے ناں بس

ہمایوں کی ضد ہے کہ پہلے وہ آئے گا۔“

”تو آنے دوا سے آخر کو پاکستان اس کا ملک ہے اس کا بھی دل چاہ رہا ہوگا یہاں آنے کو، سب کو ملے ملانے کو۔“ تایا ابا کے لہجے میں محبت رچی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر جیسے ہی اس کی سیٹ کنفرم ہوگی میں آپ کو اطلاع دے دوں گی اللہ حافظ!“ فون بند کر کے تایا ابا انہیں ہمایوں کی آمد کے متعلق بتانے لگے۔

ہمایوں ان کی اکلوتی پھپھو کا اکلوتا بیٹا تھا اور پہلی دفعہ پاکستان آ رہا تھا۔ لہذا وہ سب ہی بہت خوش تھے اور اس کے منتظر بھی۔

”آج اگر میں خدا سے کچھ اور مانگ لیتا تو یقیناً وہ بھی مل جاتا۔“ لان عبور کر کے وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی سب سے پہلے اس کا سامنا تیمور سے ہوا تھا جو اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

”تو مانگ لیا ہوتا اب کیوں افسوس کر رہے ہیں۔“ اس نے ابرو چڑھا کر کہا۔

”افسوس تھوڑی کر رہا ہوں۔“ اس نے طنز کیا۔

”میرے پاس تو بڑی بڑی قابل رشک چیزیں ہیں بھی فرصت سے آچے گا آپ کو دکھاؤں گا تو دنگ رہ جائیں گی۔“ وہ محفوظ سی مسکراہٹ سمیت بولا۔

”میرے پاس فالٹو نام نہیں ہے اوگی بوگی چیزیں دیکھنے کے لئے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔ اسی وقت سندس آپی آئیں۔

”چلیں آپی!“ انہیں دیکھتے ہی صبا نے پوچھا۔ سندس آپی جب بھی شاپنگ کرتی تھیں۔ زیادہ تر صبا کے ہی ساتھ کرتی تھیں۔ آج بھی انہوں نے صبا کو پیغام بھیجا تھا۔ اسے بھی دو چار ضروری چیزیں لینا تھیں لہذا وہ آگئی۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ تیمور بھی آج یہاں پہنچا ہوگا۔

”ہاں چلو۔“ انہوں نے چار سالہ حمزہ کی انگلی تھامی۔

تیمور کو گاڑی کا لاک کھولتے دیکھ کر وہ چکرا کر رہ گئی۔

”کیا آپ بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں؟“

”میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا بلکہ آپ میرے ساتھ جا رہی ہیں محترم خاتون صاحبہ!“ اس کی بات پر وہ چڑھ گئی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ آتی ہی نہ۔

”میری گاڑی کافی دنوں سے گڑبڑ کر رہی ہے۔ میں نے اس لئے تیمور کو روک لیا تاکہ شاپنگ کرنے میں تو آسانی رہے۔ ورنہ یہ تو رک ہی نہیں رہا تھا۔“ سندس آپی اسے بتا رہی تھیں۔

”کاش نہ ہی رکتا۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بڑبڑاتی۔

اور پھر انہیں شاپنگ کرتا دیکھ کر تیمور پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ انہیں کوئی چیز پسند ہی نہ آ رہی تھیں اگر سندس آپی کوئی جوتا پسند کر میں تو صبا مسٹر دکر دیتی اور اگر صبا کوئی سوٹ پسند کرتی تو سندس آپی کو اس میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آ جاتی۔

”تم لوگوں کو ایک جگہ سے چیز پسند نہیں آتی۔“ وہ ایک بوتیک میں تھسی ڈریس پسند کر رہی تھیں جب تیمور نے دانت کچکا کر کہا۔

”آپ کو کیا ہے؟“ صبا اسے خاطر میں لائے بغیر بولی۔

”پہننا ہم نے ہے کہ آپ نے؟“

”بس یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے ایک سی گرین کلر کے سوٹ پہ ہاتھ رکھ کر کہا جس پہ ہم رنگ دھاگے کا ہلکا کام ہوا تھا۔

”لیکن اس کی کڑھائی تو.....“ صبا نے اعتراض کرنا چاہا۔

”میں نے کہہ دیا ناں بس۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا پھر سیز مین کو اسے پیک کرنے

کے لئے کہا۔ پھر یہی نہیں اس نے ہر چیز اپنی پسند سے بلکہ دھونس سے نہ صرف اس نے آبی کو بلکہ اسے بھی ایسے ہی دلائی۔ مارے غصے کے صبا کا برا حال تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ایسے کھری کھری سنائی کہ موصوف کی طبیعت صاف ہو جائے لیکن سندس آبی کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئی۔

جیسے یہ شاپنگ کر کے وہ مارکیٹ سے باہر نکلے سندس آبی کو اپنی کوئی جاننے والی لگیں۔ ”صبا! تم حمزہ کو لے جا کر گاڑی میں بٹھاؤ تھک گیا ہے میں ابھی آئی ہوں۔“ وہ صبا سے مخاطب ہو کر تو صبا شکر کا کلمہ پڑھتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

”خواتین کی شاپنگ کے بارے میں سنا تھا آج تجربہ بھی ہو گیا۔ اف میرے اللہ! میں تو آ کر پچھتا گیا۔“ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”تو کس نے ہاتھ جوڑے تھے ہمارے ساتھ آنے کے، نہ آتے۔“ صبا کو نئے سرے سے اپنا غصہ یاد آنے لگا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرا ایک حشر ہو گیا تو ہرگز نہ آتا۔“ وہ شاپنگ بیگ گاڑی میں رکھتے ہوئے بولا۔

”بالکل اسی طرح اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کی سواری باڈی پھاری ہمارے ساتھ جارہی ہے تو میں ہرگز نہ آتی۔“ ادھر رکھنے کا اسے بھی کوئی خاص شوق نہ تھا۔

”یہ تم ہر وقت مرجیں کیوں چپاتی رہتی ہو؟“ وہ اب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

”اور خود تو جیسے ہر وقت شکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔“ دو دو بدو بولی تیمور کا قبچہ بے ساختہ تھا۔

”تم کہو تو یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔“ اس کا لہجہ بڑا ذومعنی تھا۔ صبا کچھ کھینچوڑی ہو گئی۔

”میں خواہ مخواہ کہوں۔“ اس نے بظاہر

لا پرواہی سے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگلی دفعہ آؤں تو می کو لے کر آؤں کیا خیال ہے؟“ وہ اب گردن موڑ کر اس سے مخاطب ہوا تو وہ حقیقی معنوں میں سٹیٹا گئی۔

”میری بلا سے پورے محلے کو لے آئیں۔“ بے نیازی سے کہتی وہ باہر دیکھنے لگی۔

”پورا محلہ اگر تمہیں یہاں دیکھنے آئے تو بڑا عجیب سا لگے گا تم ہی وہاں چلی جانا تاکہ سب تمہیں وہیں دیکھ لیں۔“ وہ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

”آپ.....“ مارے غصے کے سارے الفاظ کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئے اس نے غصے سے اسے ٹھوڑا چاہا لیکن کچھ تھا ضرور اس کی آنکھوں میں کہ صبا نے جزیرہ ہو کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ تیمور کے لبوں پر بڑی دلش سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

”چلو تیمور! بڑی مشکل سے جان چھڑوائی ہے۔“ سندس آبی بیٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

سندس آبی تو اسے اصرار کر کے کھانے پہ روک رہی تھیں لیکن تیمور کی نگاہیں اسے کافی ڈسٹرب کر رہی تھیں لہذا وہ معذرت کر کے کھڑی ہو گئی۔

حمزہ سوچا تھا سندس آبی اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہ صحنے پہ رہے ہوئے اپنے شاپنگ بیگ اٹھانے لگی۔

”صبا! مذاق اپنی جگہ، بٹ آئمر سیریس۔“ میں واقعی اپنے پیرئٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔“ وہ ایک دم ہی اس کے سامنے آ گیا۔

”راستہ دیں۔“ اس نے بمشکل تھوک نکل کر کہا۔

”آپ پہلے جواب دیں۔“ وہ ہنوز اس پہ نظریں جمائے کھڑا تھا۔

”جواب میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ قصداً اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”پھر کس کے پاس ہے؟“ اس نے دلچسپی سے اس کے چہرے کو دیکھا جو اس کی نظروں سے حدت سے گلابی ہو رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم، پیچھے ہٹیں، مجھے گھر جانا ہے۔“ اس نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹانا چاہا لیکن وہ اسے ایک آنچ بھی نہ ہلا سکی بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”پہلے تو بڑی بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہی تھیں اب کیا ہوا؟ بولتی کیوں بند ہو گئی ہے؟“ اس کا انداز سراسر چڑانے والا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ میرے منہ میں زبان نہیں۔“ اس کی ازلی خود سری نمود کر آئی۔

”مجھ ناچیز کی کیسے اتنی ہمت ہو سکتی ہے ایسا الٹا سیدھا خیال رکھنے کی۔“ اس کے لہجے میں مسکینیت چمکتی تھی۔

”ہاں! ایسے ہی بھولے ہیں ناں آپ۔“ اس نے طنزاً کہا۔

”بھولا بھالا ہی تو ہوں چیچی تو تم جیسی پاگل لڑکی کو.....“

”کیا میں پاگل ہوں؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر چلائی۔

”آپ کیوں پاگل ہونے لگیں ہمیں جو بنا رکھا ہے۔“ وہ پھر پڑی سے اترنے لگا۔

”راستہ دیں ورنہ میں سندس آبی کو آواز دے دوں گی۔“ اس کی دھمکی کافی کارگر ثابت ہوئی تھی وہ اسے گھورتا ہوا ایک سائیڈ پہ ہو گیا۔

”میری پسند کی چیزیں لینے کا شکریہ۔“ اپنے پیچھے اسے تیمور کی آواز سنائی دی تو وہ شور مچاتے دل کو سمجھانے باہر نکل آئی۔

آج شام پانچ بجے ہمایوں کی فلائیٹ تھی۔ نعمت کدہ کے تمام افراد ہی خاصے پر جوش تھے

کیونکہ پہلی دفعہ پچھو کے گھر سے کوئی آ رہا تھا۔

خدیجہ پچھو اپنی شادی کے دو سال بعد جب ہمایوں چھ ماہ کا تھا اپنے شوہر کے پاس امریکہ چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد وہاں جا کر ایک مصروف ہوئیں کہ پاکستان آنے کا وقت ہی نہ ملا۔ البتہ ٹیلیفون پر ان سے رابطہ رہتا تھا۔ ہر عید پر وہ انہیں کارڈز اور گفٹ دینا نہ بھولتی تھیں اس طرح نعمت کدہ بھی ہر موقع پہ انہیں یاد رکھتا تھا۔

بڑے تایا، چھوٹے تایا اور علی، ہمایوں کو ریو کر نے ایئر پورٹ جا چکے تھے۔ جب کہ بڑی امی نے صبح سے ان کو بچن میں گھسا رکھا تھا۔ سستی کی ماری یعنی سب سے زیادہ بھنجھلائی ہوئی تھی۔

پڑھائی کا بہانہ بنا کر اسے ہمیشہ ہی رعایت مل جاتی تھی لیکن آج تو ناممکن سا لگ رہا تھا۔

زین ابھی بچن میں داخل ہوا تھا۔ یعنی کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ اٹھ آئی۔

”بڑی امی! وہ انسان ہے کوئی خدائی مخلوق نہیں۔“ وہ یہاں ملنے آ رہے کھانے نہیں آ رہا

کوئی چیز کل کے لئے بھی چھوڑ دیں۔“ بڑی امی نے یعنی کو کو فٹے فرائی کرنے کے لئے کہا تو وہ تپ گئی۔

”کھانے نہیں آ رہا تو فاقے کاٹنے کے لئے بھی نہیں آ رہا۔“ ہمیں تو بس ذرا سا کام کہہ دو

تو موت نظر آنے لگتی ہے رومی اور صبا بھی تو ہیں چلو جلدی سے کو فٹے فرائی کرو ان کے آنے سے پہلے۔“ وہ حکم صادر کرنی باہر نکل گئیں تو یعنی روہاسی ہو گئی۔

”چ..... چ..... چ..... یہ ذرا سا کام تم سے نہیں ہوتا۔“ زین نے اس کی حالت پہ افسوس کیا۔

”مجھ سے نہیں ہوتا کام وام، مجھے کام کرنے سے نفرت ہے۔“ اس نے دانت پیس کر کہا زین نے زبردست قبچہ لگایا۔

”چلو جاؤ تم، میں فرائی کر لیتا ہوں، اس طرح بریکس بھی ہو جائے گی۔“

”بریکس کس بات کی؟“ اس کی آخر پر وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

”بھئی سیدی سی بات ہے کل کو اگر تمہارے جیسے کوئی چھو ہڑل کر لگتی تو میرا کیا بنے گا لہذا بہتر یہی ہے کہ پہلے سے ہی اپنے آپ کو تیار کر لیا جائے۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ شرارت سے گویا ہوا۔

”زین! میں تمہیں چھوڑ گئی ہوں؟“ اسے بس ایک بات ہی سمجھ میں آئی تھی۔

”تو اور کیا تمہیں راحت کہوں؟“ وہ بھی لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا تو عینی کو ہنسی آ گئی۔

”افوہ! باتوں میں بہت ہی نہیں چلاکتی دیر ہو گئی ہے اگر بڑی امی آئیں تو خیر نہیں۔“ اس نے جلدی سے برز جلا کر کڑا ہی اوپر رکھی اور کویتے فرائی کرنے لگی۔ رومی اور صبا غائب اوپر جا چکی تھیں۔

پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب ایئر پورٹ سے واپس آ چکے تھے۔ پہلے گھر کے بڑے افراد ہمایوں سے ملے تھے تھوڑی دیر بعد بینک جنیریشن اس کے گرد جمع بھی اور تعارف کر مرحلہ گزر رہا تھا۔ علی چونکہ اس سے ایئر پورٹ سے ہی تعارف حاصل کر چکا تھا لہذا وہ اب ان سب کا تعارف کروا رہا تھا۔ صفی، زین اور شہزاد کے بعد وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ نور العین ہے اور یہ رومیہ ہے، یہ صبا جیت ہے۔“ وہ تینوں ایک ہی صوفے پر بٹھتی ہوئی تھیں علی نے اشارے سے ان تینوں کی اسے متوجہ کیا۔ ہمایوں نے کچھ چونک کر صبا کی طرف دیکھا کانوں میں مہم کے الفاظ گونجنے لگے۔

”تمہارے بڑے ماموں کی بیٹی صباحت! کبھ گئے ناں؟“ اور اس وقت اس نے بڑے

زور و شور سے سر ہلایا تھا۔

”آپ پہلی دفعہ پاکستان آئے ہیں؟“ عینی کے سوال پر رومی کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے کل سے بڑی امی کوئی سات نو مرتبہ بتا چکی تھیں کہ ہمایوں پہلی دفعہ آ رہا ہے پاکستان۔

”ہوں..... لیکن آپ سب کو دیکھ کر انفسوس ہو رہا ہے کہ مجھے بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا۔“ وہ شگفتگی سے مسکرایا۔

”کیوں..... وہاں آپ کے ریلیو ز نہیں ہیں؟“ صبا نے پوچھا۔

”میرے ایک چاچا اور پچھو امریکہ میں ہی ہوتے ہیں لیکن آنا جانا ذرا کم ہی ہوتا ہے۔“ وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو جو باقی باتیں بعد میں کر لینا پہلے ڈنر کرو۔“ چچی جان نے اندر آتے ہوئے کہا تو وہ سب کھڑے ہو گئے۔ کھانا نہایت بے تکلفی کے ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ہمایوں بھی ان کی طرح شوخ مزاج اور ہنس کھنکھانے لگا تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس دوران ہمایوں ان سب کو پچھو کے متعلق بتاتا رہا۔

”اب کافی ٹائم ہو گیا ہے اس لئے سونے کی تیاری کرو۔ باقی باتیں صبح کر لینا۔ ہمایوں تھک گیا ہو گا اسے بھی آرام کرنے دو۔“ تایا ابا اٹھتے ہوئے بولے تو ان سب کو بھی احساس ہوا واقعی کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ سب جمائیاں روکتے اپنے اپنے گمروں میں سونے کے لئے چل دیئے۔

اگلی صبح ہمایوں کی آنکھ کھلی تو وال کلاک گیارہ بج رہا تھا۔ اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ نہا دھو کر فریش ہو کے وہ باہر نکلا تو سب سے پہلے بڑی امی سے سامنا ہوا۔

”اٹھ گیا میرا لعل! نیند تو آگئی تھی ناں۔“

وہ اپنے مخصوص پر شفقت لہجے میں بولیں۔

”جی۔“ سعادت مندی سے کہتا وہ ان کے پاس بی بیٹھ گیا۔

”رومی! بیٹا ناشتہ لاؤ ہمایوں کے لئے۔“ انہوں نے رومی کو آواز دی۔

”کیا لیس گے آپ ناشتے میں، پراٹھا، انڈہ، توست، دودھ، چائے۔“ وہ ایک سانس میں ہی پوچھتی چلی گئی۔

”جول جائے وہی کھالوں گا۔“ اس کی کسر نفی پر وہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

”آپ لوگوں نے ناشتہ کر لیا۔“ وہ جونہی ناشتے کی ٹرے لے کر آئی ہمایوں پوچھ بیٹھا۔

”جی ہاں کیونکہ باقی معاملات میں چاہے ہمارے گھر میں بے ترتیبی رہ جائے لیکن کھانا ہمیشہ وقت پر کھایا جائے گا کیونکہ ایک سے بڑھ کر ایک بھوکا تو اس گھر میں موجود ہے۔“ اس کی بات پر وہ ہنس پڑا تھا جب کہ بڑی امی نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا جس کا حسب معمول اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

”باقی سب افراد کہاں ہیں نظر نہیں آ رہے۔“ غیر معمولی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”چچی جان، عینی اور شہزاد تو صبح ہی کالج چلے جاتے ہیں زین یونیورسٹی میں اور تایا ابا ابو جان اور بیچا جان اور علی آؤں میں جب کہ صفی کا کوئی پتہ نہیں کہاں مرگشت کر رہا ہو گا۔“ رومی نے تفصیل بتائی۔

”کیوں..... وہ فارغ ہی ہوتا ہے؟“ ہمایوں نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

”نی الحال کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ جب تک اس کا ایم اے کارڈ نہ آ جائے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ آخر کو دوسری مرتبہ تو بیچارے نے ایکزامز دیئے ہیں بقول صفی کے کہ چچی مرتبہ تو قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔“ وہ شروع ہو چکی

تھی۔

”رومی! ذرا میری دوائیاں تو لا دو رات کو علی لایا تھا شاید اسی کے کمرے میں پڑی ہوں۔“ بڑی امی نے اسے وہاں اٹھایا ورنہ نہ جانے اور کتنے ”خوبصورت انکشاف“ کر دیتی۔

”ایک تو ہماری اولادیں بھی جاہل ہیں بہت نہیں کب منتقل آئے گی۔“ انہوں نے کس کس سوچا۔ ہمایوں نے ناشتہ کر لیا تو وہ برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

”رومی! اکل جو میں نے تمہیں سی ڈی پکڑائی تھی وہ کہاں رکھی ہے۔“ صبا ایک ہی جست میں دو، دو سیڑھیاں پھلاکتی نیچے آ رہی تھی۔ سامنے صوفے پر ہمایوں کو براجمان دیکھ کر کھل سی ہو گئی۔

”اٹھ گئے آپ؟ ناشتہ کر لیا؟“ خجالت مٹانے کو اس نے فوراً پوچھا۔

”جی..... ابھی ابھی کیا ہے۔“ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”نیند ٹھیک طرح سے آگئی تھی۔ اچانک کی بنی جگہ یہ انسان تھوڑا ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ناں اور آپ تو پہلی دفعہ پاکستان آئے ہیں۔“ وہ اب اس کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔

”بالکل ٹھیک طرح سے نیند آئی تھی۔ مجھے تو ایک دفعہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ میں اجنبی جگہ پر، اجنبی لوگوں کے درمیان ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”یہ تو آپ کی محبت ہے جو آپ اس طرح محسوس کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”اس میں کافی حد تک آپ سب کی اپنائیت کا ہی ہاتھ ہے۔“ اس نے جوابا کہا۔

”تعریف کے بدلے میں تعریف کر کے بدلہ اتار رہے ہیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”نہیں بلکہ کر بھلا ہو بھلا کے فارمولے پر عمل کر رہا ہوں۔“ اس کا جواب بڑا بے ساختہ تھا۔

”آپ کی اردو کافی اچھی ہے۔“ وہ واقعی متاثر ہوئی تھی۔

”اب میں آپ کی تعریف کروں یا نہ؟“ شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔ ہمایوں کو لگا کہ اس کا آنا بے کار نہیں گیا۔

”اے لڑکی! کہاں بھاگی جا رہی ہو ذرا چھری تلے دم تو لو۔“ یعنی اپنی رو میں بھاتی ہوئی اندر چار رہی تھی جب پوری فوت سے زین سے نکل کر اُلی۔

”انورہ..... زین! تم تو پیچھے بٹو۔“ اس نے جھنجھلا کر اسے پرے دھکیلا اور اسی رفتار سے بھاگتی ہوئی غڑاپ سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اندر آ کر اس نے سب سے پہلے ریڈیو آف کیا۔

”اوہو..... یعنی! ریڈیو کیوں بند کیا ہے میرا پسندیدہ پروگرام آنے والا ہے۔“ صبا نے گھور کر یعنی کو دیکھا۔

”پہلے میری بات سن لو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“ وہ اس کی گھوری کو نظر انداز کر کے بولی۔

”کیوں ایسی کون سی خاص بات ہو گئی ہے۔“ رومی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”تمہیں پتہ ہے ہمایوں پاکستان کیوں آئے ہیں؟“ اس کے لہجے کو راز دارانہ بنایا۔ رومی اور صبا کے سر فنی میں ملے تھے۔

”میں ابھی ابھی سن کے آئی ہوں بڑی امی اور تانا بابا میں کر رہے تھے کہ خدیجہ پھپھو جب امریکہ گئی تھیں انہوں نے بڑی امی اور تانا بابا سے کہا تھا کہ وہ صبا کو اپنے ہمایوں کی دہن بنا میں گی۔ اسی لئے ہمایوں بھائی پاکستان آئے ہیں۔“ یعنی کے انکشاف پر صبا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”اوہو۔“ رومی نے معنی خیز نظروں سے صبا کو دیکھا۔

”تو محترمہ صباحت صاحبہ! اب آپ کی بوریت یقیناً ختم ہو جائے گی کیونکہ عنقریب ہمارے گھر میں بھی ایک فنکشن ہونے والا ہے۔ دیکھ لو تمہاری دعا کتنی جلدی قبول ہو گئی۔ کیا خیال ہے پھر آئندہ بقرہ عید پر تمہاری رحمتی نہ کروادوں وہ بھی امریکہ۔“ وہ شرارت سے اس کی طرف دیکھتی ہو چھ رہی تھی جب کہ صبا غائب دماغی سے اسے دیکھ گئی اس کا دماغ ابھی تک سائیں سائیں کر رہا تھا۔

”میں واقعی اپنے پرنس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔“ کسی کا گھمبیر لہجہ اس کی سماعت سے نکل آیا تو وہ گھبرا گئی۔ رومی اور یعنی اپنے ہی بلان بنارہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

”پچی شرما رہی ہو۔“ اپنے پیچھے اسے رومی کی آواز سنائی دی تھی۔

پچی نہیں کیا بات تھی حالانکہ اس کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ ہمایوں جیسا بینڈم، پڑھا لکھا شخص اس کا شریک سفر بننے جا رہا تھا۔ لیکن وہ خوش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید گزرتے دنوں میں اس نے تیور کو بہت سوچا تھا شاید وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کے رد دل پر دستک دی تھی یا شاید اس کے جذبے ہی اتنے گھرے تھے کہ وہ بے خیالی میں نجانے کیا کچھ سوچ چکی تھی۔ کہنے کو تو بہت باتیں ہو سکتی تھیں لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کا اپنا دل بھی تیور کی طرف ہمک رہا تھا۔

”لیکن ہمایوں.....“ سوالیہ نشان بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔

ہمایوں اور علی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آئے تھے۔ علی آج اسے اپنی فیکٹری دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔ واپسی میں ایک، دو مشہور جگہیں

اسے دکھاتے ہوئے وہ گھر لوٹا تھا۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ جونہی اندر داخل ہوئے تو ایک دم ہی ٹھٹھک کر رک گئے۔ عین سامنے رکھے صوفے پر رومی اپنے ارد گرد سے بے نیاز نیند کی وادیوں میں گم تھی۔ دوپٹہ صوفے کی پشت پر پڑا تھا۔ لمبے سیاہ بال بے ترتیبی سے بھرے تھے جو اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ بلیک اور بلیو پرنٹ سوٹ میں ہم رنگ چوڑیاں کلائی میں پہنے وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔ ہمایوں نے اپنی زندگی میں حسن تو بہت دیکھا تھا لیکن یوں ”مدہوش حسن“ آج پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ہمایوں کی محویت علی کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

اب پتہ نہیں ہے چار، نگاہوں کا اثر تھا یا کوئی اور بات رومی نے کسمار کر آنکھیں کھولی تھیں۔ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر وہ اٹھ گئی تھی لیکن پوری طرح نیند سے بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ہمایوں نے ہمیشہ اس کو دوپٹے میں ہی دیکھا تھا۔ سر ڈھانپے ہوئے۔ اسے کچھ عجیب سا تھک لگا تھا لیکن چند دن یہاں رہنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بڑے ماموں اور مامی خاصی سخت طبیعت کے مالک ہیں اور لڑکیوں کی بے جا آزادی کے سخت خلاف تھے۔

علی کی غصیلی نظروں کے تعاقب میں اس نے دیکھا تو فوراً اپنے حلیے کا احساس ہوا۔ صوفے کی پشت سے دوپٹہ اٹھا کر اس نے جلدی سے اوڑھ لیا۔

”آپ لوگ کب آئے؟“ اسے جانے کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔ حالانکہ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار ابھی بھی بلکورے لے رہا تھا۔ ہمایوں کو اپنی ہارٹ بیٹ مس ہوئی محسوس ہوئی۔

”ابھی ابھی.....“ جائے مل سکتی ہے؟“ علی کا بس نہیں چل رہا تھا کسی طریقے سے اسے

یہاں سے غائب کر دے۔ ہمایوں کا لحاظ کر کے اس نے کوئی بھی سخت بات نہیں کہی تھی۔ جواباً اثبات میں سر ہلاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ”پورے گھر میں سے سونے کے لئے سمیٹ رہی ایک جگہ کی تھی۔“ وہ چائے کا پانی رکھ رہی تھی جب اپنے پیچھے علی کی آواز سنائی دی۔ ”نہیں جان بوجھ کر تھوڑی سوئی تھی۔ میں تو نہا کر آئی تھی۔ وہیں بیٹھ کر بڑی امی سے باتیں کر رہی تھی، پتہ ہی نہیں چلا کہ کب نیند آ گئی۔“ برسرِ جلاتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم تو اپنے آپ سے بے نیاز لیٹی تھی تمہاری بلا سے جو مرضی اندر آ جائے۔“ اب دفعہ اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ ”کوئی آیا تو نہیں ناں۔“ اس نے نیازی سے کہا۔

”اچھا..... ابھی ”کوئی“ نہیں آیا۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ چونک گئی۔ ”تم اور ہمایوں ہی تھے اور وہ بھی تو میرا کزن ہی ہے تمہاری طرح۔“

”تم ہمایوں کو مجھ سے کیوں کمپیئر کر رہے ہو۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

”میں نے تمہیں کب کمپیئر کیا ہے علی!“ نیند سے بھاری پپوں اور خمار آلود نگاہوں میں حیرت تیرنے لگی تھی۔ علی چند لمحے بے خود سا اسے دیکھنے لگا۔

”ایک بات تو بتاؤ، تمہیں مجھ میں اور باقی تمام کزنز میں کوئی فرق نہیں آتا۔“ اس نے بھاری لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں۔“ وہ نظریں چرا گئی۔

”جھوٹ مت بولو۔“ اس کے لبوں پہ بڑی دلفریب سی مسکراہٹ ٹھہر گئی رومی کا چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ علی نے خاصی دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”علی!“ وہ اس کی نظروں کی حدت سے گھبرا گئی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو، میں کنفیوز ہو رہی ہوں۔“

”پھر کیسے دیکھوں کہ تم کنفیوز نہ ہو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”مجھے نہیں پتہ، تم نکلو یہاں سے۔“ اس نے اسے پرے دھکیلا۔

”دھکے تو مت دو ظالم لڑکی! چلا جانا ہوں۔“ وہ احتجاجاً چلا گیا۔

”لااتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“ وہ اسے چڑائی ہوئی دوبارہ کیتلی میں پانی اٹیلے لگی۔ جو باتوں کے دوران آدھا رہ گیا تھا۔

آج اتوار کا دن تھا چھٹی ہونے کی باعث وہ سب گھر پہنچے تھے۔ سنگ روم میں سب کی محفل ختم ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں اور جب مرد حضرات کی ساری گفتگو ”برنس“ کے گرد گھومنے لگی تو وہ تینوں اکٹا گئیں۔

”بیٹا! اچھی سی چائے ہی پلا دو۔“ چچا جان ان کی بیزار شکلیں دیکھ رہے تھے لہذا بہانے سے اٹھ ادا وہ تینوں بھی فوراً اٹھ گئیں۔

”تم کہاں جا رہے ہو خود را!“ صفی کو اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ کر تایا ابا نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”اگر سی گئیں بھی نہیں، بس ویسے ہی ٹانگیں ذرا اکڑ سی گئیں تھیں۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔

”سارا دن آوارہ گردی کرتے تو کبھی ٹانگیں نہیں اکڑیں۔“ تایا ابا کے درشت لہجے پر وہ جی بھر کے بد مزہ ہوا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ اتنی تھیں قسم کی گفتگو سن رہا تھا جو اسے ہرگز ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”چلو صبا! اب چائے تم اندر دے کر آؤ۔“

چائے کے ساتھ پیسٹر اور کیک ٹرائی میں رکھتے ہوئے رومی نے صبا سے کہا۔

”میں نہیں جا رہی تم ہی دے آؤ پلزز۔“ اس کا انداز بھی تھا۔

”تم نے تو ابھی سے شرمانا شروع کر دیا۔“ رومی کے شوخ لہجے پر وہ بوہی رخ موڑ کر فریج کھول کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ اب اسے کیا بتانی کہ وہ تو ہمایوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی کس قدر اٹی تھی۔ اس وقت اس کی حالت خود اپنی سمجھ سے باہر تھی کسی دوسرے سے کیا شہر کرئی۔

”یہاں کا سٹم مجھے تو بڑا عجیب سا لگا ہے ہر جگہ یہ بد نظمی سی ہے رولز اینڈ ریگولیشنز تو نام کے بھی نہیں۔ ہر شخص کو صرف اپنی پڑی ہے۔ پڑھے لکھے اور جاہل برابر ہیں کوئی بھی ان میں تمیز نہیں کر سکتا۔“ وہ چائے لے کر اندر چلی تو ہمایوں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

”لیکن بیٹا! یہ باتیں تم سب پاکستانیوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ یہاں پر بہت سے ویل منیجر لوگ بھی ہیں۔“ تایا ابا کی اپنے ملک سے ازلی محبت کو دکر آئی تھی۔

”آپ کی بات بھی ٹھیک ہے ماموں جان!“ وہ اسے موقع پر ہی ڈنارہا۔

”آپ ٹوک بھی امریکہ چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں وہاں ہر بات میں ہر چیز میں آپ کو ڈسپنر نظر آئے گا۔“

”ٹھیک ہے ہر ملک کے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں لیکن ہمایوں! ہر ملک میں اچھائی اور برائی بھی ہوتی ہے تم صرف اچھائی کو مد نظر رکھ رہے ہو اور برائی کو نظر انداز کر رہے ہو۔“ علی بھی گفتگو میں شریک ہوا۔

”میں وہاں کی برائیوں کو انور نہیں کر رہا لیکن تم خود آبرو کر لو وہاں کے جتنے بھی ویک پوائس ہیں وہ یہاں بھی موجود ہیں۔“ رومی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی ہوئی چائے سرو کر

رہی تھی۔

”یہی تو ہمارا سب سے بڑا ویک پوائنٹ ہے کہ ہم ان لوگوں کو فلو بھی کرتے ہیں تو صرف فنی باتوں میں۔“ پچا جان کے لہجہ میں افسوس جھلک رہا تھا۔

”یہ بات ہی تو میں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ کہ آج کے پاکستانی بھی اتنے براڈ مائنڈ ہو گئے ہیں کہ امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے اپنے گھر کا ماحول تھوڑا نائیٹ رکھا ہے تو یہ آپ کی ذاتی کاوش ہے اس میں ماحول کا اتنا عمل دخل نہیں اور اگر آپ چاہیں تو یہ ماحول کسی بھی ملک میں رہنے کے باوجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔“ ہمایوں نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

”تم کہنا چاہتے ہو کہ ہمیں پاکستان کی بجائے امریکہ میں جا کر رہنا چاہیے۔“ اس ساری بحث سے صفی یہی نتیجہ اخذ کر پایا تھا۔

”بالکل۔“ اس نے چائے کا سیپ لیتے ہوئے کہا۔

”اب دیکھو ناں وہاں کی ہر چیز کا ایک سینیئر ڈس ہے وہاں کا معیار زندگی بالکل ڈفرنٹ ہے۔ ایک اچھی لائف گزارنے کے لئے وہاں ہر قسم کی فسیلٹیز ہیں۔ جب کہ یہاں کی لائف تو بالکل اس کے الٹ ہے۔ ہر طرف ایک بے ترتیبی سی ہے، جگہ جگہ گندگی، کوڑے کے ڈھیر اور فضائی آلودگی اتنی بڑھ چکی ہے کہ.....“

”ایک منٹ ہمایوں صاحب!“ رومی بے اختیار ہی اسے ٹوک گئی وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ جو دھرتی ہے ناں خواہ صاف ستھری ہو یا گندی سندی، یہ ہمیں بہت عزیز ہے اس لئے کہ اسے کوئیس نے اتفاقاً نہیں دریافت کیا بلکہ یہاں کے ایک ایک ذرے میں ہمارے بزرگوں کا خون رچا ہوا ہے یہ ہمیں بالکل اپنی ماں کی طرح عزیز ہے اور اپنی ماں کی طرح ہی ہم اس سے

عقیدت رکھتے ہیں، ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے آپ اسے ہماری مجبوری سمجھ لیں ہمارے ایک بہت اچھے لکھنے والے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی وہ کہتے ہیں کہ اگر ماں، میلی چمکی اور جھربوں زدہ چہرہ والی ہو تو کیا ہم اسے چھوڑ کر لڑتے ہیں؟ کیا اپنی ماں تسلیم کر لیں گے؟ نہیں..... نہیں..... ناں جس طرح اپنی سگی ماں کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کی والدہ کو اپنی ماں نہیں بنا سکتے اسی طرح ہم اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسروں کے ملک کو اپنا ملک تسلیم نہیں کر سکتے۔“ اس کا لہجہ قطعیت لئے ہوئے تھا۔ تایا ابا کا سر فخر سے بلند ہو گیا پانی سب کی آنکھوں میں بھی اس کے لئے سناسن ابھری تھی۔ جب کہ ہمایوں اپنی پرسوج نگاہیں اس پہ جمائے مستقل کچھ سوچے جا رہا تھا۔

”علی! مجھے چھوڑ آؤ نا پلزز۔“ رومی کی فریڈ کی شادی تھی۔ اس نے اتنا اصرار کیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے رومی کو چانا پڑ رہا تھا۔ وہ تیار ہو کر اب علی کی منتیں کر رہی تھی۔ ویسے اگر وہ چاہتی تو صفی، زین یا شہزاد کسی بھی کہہ سکتی تھی اور وہ اسے چھوڑ آئے۔ لیکن وہ تینوں لارواہ سی طبیعت کے مالک تھے جب کہ علی کی موجودگی میں اسے تحفظ کا ایک احساس رہتا تھا۔

”ابھی تم نے مارکیٹ بھی جانا ہے پہلے رستے میں اس کے لئے ٹکٹ خریدو گی، بیک کر دو گی۔ پھر کہیں اپنی دوست کے گھر پہنچو گی اور واپسی کے لئے پھر ایک درد سر۔“ وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا۔

”میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی علی! جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔“

”جانتا ہوں تمہاری تھوڑی دیر، چھ گھنٹے سے پہلے اٹھنے والی نہیں تم اور مجھے ابھی ایک ضروری میٹنگ میں بھی شرکت کرنا ہے۔“ وہ جیسے مزہ لے رہا تھا۔

”مرد تم، اب بات مت کرنا مجھ سے۔“ وہ چند سیکنڈ اسے گھورنے کے بعد دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں۔ اس کا غصہ سے سرخ چہرہ علی کو لطف دے گیا وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ جانتا تھا تھوڑی دیر بعد وہ پھر خود ہی آجائے گی۔

”ہمایوں! صبح آپ نے ابو جان سے گاڑی کی چابی لی تھی؟“ وہ ہمایوں کے کمرے میں داخل ہو کر پوچھ رہی تھی۔ ہمایوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور گویا نگاہیں پلٹنا بھول گئی تھیں۔ ایک تو تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے دوسرا غصے سے اس کی گلابی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ ڈیپ پنک کمر کے سوٹ میں لائٹ سامیک اپ کئے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہمایوں مہبت سا ہو گیا۔

”میری دوست کی شادی ہے اگر آپ فارغ ہیں تو مجھے اس کے گھر تک چھوڑ آئیں گے؟“ اس نے کچھ جھجک کر پوچھا تھا کیا پتہ وہ ماسٹڈ ہی نہ کر جائے۔

”ایس..... وائے ناٹ۔ اس مائی پلیئر۔“ وہ ایک دم ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

ان دنوں کو ایک ساتھ سیڑھیاں اترتے دیکھ کر علی گنگ رہ گیا تھا۔ اسے رومی سے اس رد عمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ناگواری کی شدید لہر اسے اپنی پلیٹ میں لے رہی تھی۔ مگر بمشکل یہ ضبط کر کے اس نے خود کو کچھ بھی کہنے اور کرنے سے باز رکھا تھا۔

”ہیل مارکیٹ تک جانا ہے مجھے ابھی گفت بھی خریدنا ہے۔“ ہمایوں ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم کہو تو میں افق کے پار جانے کو بھی تیار ہوں۔“ اس کی بات پر رومی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ہمایوں ایک پل کو گھوم گیا۔ جب کہ وہ علی کو چرا کر اتنا خوش ہو رہی تھی کہ ہمایوں کا لہجہ اور

نگاہیں محسوس نہ کر سکی۔

نام کانی ہو رہا تھا لہذا اس نے جلد ہی ایک گفٹ پسند کر کے پیک کرنے کو کہا۔ گفٹ لے کر وہ باہر نکلے تو ہمایوں سے ایک جیولر کی شاپ میں لے گیا۔

”میں نے بھی کسی کے لئے گفٹ خریدنا ہے میری بھی ہیلپ کرو۔“ اس کے استحقاق بھرے لہجے پر وہ مسکرا دی۔ یقیناً صبا کے لئے کوئی چیز لینی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

”لیکن یہ گفٹ دینا کسے ہے؟“ دل میں چلتے سوال کو وہ یوں تک لے ہی آئی۔

”اک نہایت ہی دلچیز ہستی کو۔“ اس کی بات پر رومی کا خیال، یقین میں بدل گیا۔ صبا کو بریسلٹ بہت پسند تھا۔ اس نے ایک نازک بریسلٹ پسند کر لی۔

”اب جلدی چلیں دیر ہو رہی ہے۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

”واپسی پہ لینے آؤں؟“ مطلوبہ گھر کے سامنے پر یک لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”اگر زحمت نہ ہو تو۔“ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ڈونٹ بی فارل یار!“ وہ تھوڑا سا جھلا گیا۔

”ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ یہیں ملیں مجھے۔“ وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔

”یہ صبا آج کل بہت گم صم رہے گی ہے شاید مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔“ میگزین کے ادوارتی بے دلی سے پلٹتے ہوئے اس کا ذہن صبا کے گروگھوم رہا تھا۔

”کہاں تم ہو جی۔“ ہمایوں اس کے قریب آ کر بیٹھا تو وہ چونک گئی غیر محسوس انداز میں وہ آگے کھسک گئی۔ ہمایوں کی نظروں سے اس کی حرکت پوشیدہ نہ رہی تھی۔

”ایک بات کہوں تم سے رومی!۔“ چند سیکنڈ اسے بغور دیکھنے کے بعد وہ گویا ہوا۔

”کیا؟“ اس کی گہری نظریں رومی کے الجھن میں مبتلا رہی تھیں۔ اس نے نہایت سہولت سے رومی کی کلائی پکڑی اور جینز کی پاکٹ سے بریسلٹ نکالا۔

”یہ تمہارے لئے ہے۔“ وہ بریسلٹ اس کی کلائی کی زینت بنا چکا تھا رومی گنگ رہ گئی۔

”لیکن..... یہ..... تو صبا۔“ مارے حیرت اور صدمے کے الفاظ رومی کے حلق میں انک کر رہ گئے۔

”یہ ٹھیک ہے کہ می نے صبا کے لئے کہا تھا لیکن انہوں نے فیصلہ میرے سپرد کیا تھا اور میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“ وہ کہہ کر رکائیں تھالے بے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”رومی! پاپی تو پاؤ۔“ اتنے میں علی کمرے میں داخل ہوا اور صوفے پر گر گئے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ مکالمی انداز میں اٹھی۔ کلاس میں پانی انڈیل کر علی کی طرف بڑھایا۔ کلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے علی کی نظریں بے اختیار ہی اس کی کلائی میں پڑے بریسلٹ کو چھو گئیں۔ رومی کا ہاتھ لرزا تھا اور اگلے ہی پل گاس زمین بوس ہو گیا۔ وہ بھاگی ہوئی اوپر چلی گئی۔ علی حیرت کا بت بنے وہیں بیٹھا رہ گیا۔

”اگر صبا کو پتہ چل گیا کہ ہمایوں مجھ میں انوالو ہے تو؟“ کہا میں اس کی شکایتی نظریں برداشت کر سکوں گی؟ کیا اسے دکھ دے کر میں خوش رہ سکوں گی؟ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو ہمایوں کو صبا کے حوالے سے ہی سوچا تھا۔ وہ سب ڈر کر رہے تھے جب کہ وہ پچھلے پندرہ منٹوں سے بس پلیٹ میں ڈالے چاولوں میں چپے گھما رہی تھی۔

علی مسلسل اس کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ وہ

اپنے خیالوں میں اتنی محنت کی علی کی خود پہ گزری نظریں بھی نہ محسوس کر سکی۔

”اور اگر ہمایوں نے بڑوں تک یہ بات پہنچا دی تو؟ اگر علی کو علم ہو گیا تو؟“ کتنے ہی بھیانک قسم کے ”اگر“ منہ کھولے کھڑے تھے وہ اپنے خیالوں کی پورش سے گھبرا گئی تو کرسی دھیل کر گھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا؟ کھانا تو کھا لو۔“ اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر امی جان نے کہا۔

”میں کھا چکی..... بس.....“ پلیٹ میں چاول جوں کے توں موجود تھے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی علی کی نظروں نے آخر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ اس نے نظریں گھا کر ساتھ بیٹھے ہمایوں کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی علی کا ذہن نئے سرے سے الجھنے لگا۔

سندس آپی کے بھائی کا پریوزل آیا تھا صبا کے لئے۔ ان کے والدین کو تو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن بڑی امی نے بعد میں سندس آپی کو بتا دیا تھا کہ صبا کی نسبت بچپن سے ہمایوں کے ساتھ طے ہے۔ تیور کو پتہ چلا تو وہ سراپا احتجاج بن گیا۔

”یہ تم نے کیا کیا صبا؟“ اس نے نعت کدہ کا نمبر ڈال کیا۔ اس کی قسمت کو نون صبا نے ہی ریسو کیا۔

”تقدیر اپنا فیصلہ کبھی بھی کسی سے پوچھ کر نہیں کرتی تیور صاحب!“ اس کا اپنا دل ڈوب رہا تھا۔

”لیکن ایسا میرے ساتھ ہی کیوں؟ میرے جذبے تو پاکیزہ تھے میں نے تو بڑے سیدھے طریقے سے ہمیں اپنانا چاہا تھا۔ پھر یہ ظلم میرے ساتھ کیوں کیا گیا؟“ اس کے درد کی آج صبا کو اپنے دل تک آتی محسوس ہوئی۔

”چند ایک ملاقاتوں کو آپ محبت کا نام نہیں

دے سکتے۔ آپ کو صرف فی الحال ایسا محسوس ہو رہا ہے۔“ اس سے زیادہ وہ خود کو لکھی دے رہی تھی۔

”محبت تو محبت ہوتی ہے صبا! خواہ ایک لمحہ پر محیط ہو یا صدیوں پر لیکن میں اتنی جلدی پار ماننے والوں میں سے نہیں۔ تم میرا ساتھ دو گی ناں صبا!“ کیا تھا اس کے لہجے میں ڈر، آس، امید یا خواہش؟ مزید برداشت کا اس میں حوصلہ ہی تھا نہ۔ ریسور کریڈل پر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”صبا! کیا ہوا؟“ رومی لپک کر اس کے پاس آئی۔

”مجھے بچالو رومی! پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے؟“ وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ چلو اپنے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے کمرے میں لے گئی۔ دروازہ لاک کر کے اسے بیڈ پہ بٹھا دیا۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے نرمی سے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے پوچھا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا رومی! اک طرف عزت ہے تو دوسری طرف محبت ایک طرف جھکوں تو دوسرا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔“ پھر وہ اسے بتاتی چلی گئی۔ تیور اور اس کی ہونے والی چند ایک ملاقاتیں، اس کے پریوزل سے انکار پر تیور کا براہ احتجاج فون، اس کا ہمایوں سے کترانا۔ رومی حیرت میں ڈوبی اسے سنتی رہی۔

”دیکھو اس طرح رو رو کر خود کو بلکان مت کرو۔ اللہ تعالیٰ جو بھی کریں گے یقیناً بہتر کریں گے۔“ شاید اس کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو بھی تسلی دی۔

دل تو اس کا بھی بلکان ہو رہا تھا اگر ہمایوں کی ایما پر اسے اس کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا تو وہ کیا کر لیتی؟ اس نے اپنے دل میں جھانکا کیا

وہ علی کے بغیر رہ لے گی؟ انہوں نے آپس میں کبھی عہد و پیمان نہیں کئے تھے تو کیا وہ ایک دوسرے کے احساسات کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔

ہمایوں واپس چلا گیا تھا لیکن جاتے ہوئے اس کی نیندیں اڑا گیا تھا۔
”میں فی الحال جا رہا ہوں لیکن جلد ہی تمہیں لینے دوبارہ آؤں گا۔ تمہارے بغیر میرا ہر پل بے سکونی میں گئے گا۔ جی تو چاہ رہا ہے کہ میں ساتھ ہی لے جاؤں لیکن مجبوری ہے۔ اوکے۔ اپنا خیال رکھنا میری خاطر۔“ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے وہ باہر نکل گیا جب کہ رومی بے جان سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ نجانے اب کون سی قیامت آنے والی تھی۔

ہمایوں کو گئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ ایک رات کو تاپا ابا نے سب کو سٹنگ روم میں بلوایا تھا۔ سب کے دل ہی الگ الگ خوف لئے دھڑک رہے تھے کسی انہونی کا احساس خطرے کی طرح سر پہ منڈلا رہا تھا۔

”تم سب لوگ ماشاء اللہ اب بڑے ہو چکے ہو اور شادی کے قابل ہو۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ باہر ادھر ادھر جھانکنے کی بجائے گھر کی بات گھر میں رہ جائے۔“ تاپا ابا نے بات کا آغاز کیا۔ ان سب کے دلوں کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو گئی تھیں۔ نجانے تقدیر کس رخ سے اپنا وار کرنے جا رہی تھی۔

”تمہاری خدیجہ پھپھو کا بھی فون آیا تھا۔ وہ رومیہ کو اپنی بہو بنانے کی خواہشمند ہیں۔“ رومی اور علی کے دل میں بیک وقت کسی نے حجر اتارا تھا۔

”لیکن علی کی بابت آپ مجھ سے بھی وعدہ کر چکے تھے بھائی جان!“ امی جان کی آواز رومی کو کسی گھائی سے آنی محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے محسنہ! ہم وعدہ

خلافوں میں سے نہیں۔ مجھے رومیہ اور نور العین میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ رومیہ کے لئے اگر خدیجہ کی خواہش ہے تو ہم نور العین کو اپنی بیٹی بنالیں گے۔“ یہ دوسرا ہم تھا جو ان سب کے سروں پر بلاسٹ ہوا تھا۔ یعنی اور زین بری طرح تڑپ کر رہ گئے تھے۔ چچی جان نے شاکی نظروں سے تاپا ابا کو دیکھا۔ کیونکہ زین جب پڑھنے کی خاطر نعت کدہ میں ٹھہرا تھا تو چچی جان نے کہا۔
”زین میرا بھانجا نہیں بیٹا ہے بھائی جان! شہزادہ تو چھوٹا ہے لیکن زین کے لئے میں لڑکی نعت کدہ سے ہی لوں گی۔“

”ہمیں تمہاری درخواست بھی یاد ہے نگہت! اگر زین العابدین کو تم نے بیٹا کہا ہے تو وہ ہمارا بھی بیٹا ہے اور تم ہمارے لئے خدیجہ کی ہی طرح ہو لہذا آج سے تم صابحت کو اپنی بیٹی سمجھو۔“ یہ تیسری قیامت صغریٰ تھی۔

”سارے افراد اور رشتے گھر کے ہی ہیں لہذا منگنی وغنی جیسا کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔ ہم قول کے کچھ لوگ ہیں اپنی باتوں سے پھرنے والے نہیں۔ البتہ شادیوں پر جیسے مرضی اپنے ارمان پورے کر لیتا۔ اس بقرعید یہ تمہاری پھپھو بھی آ جائیں گی۔ لہذا نکاح بقرعید کے مبارک دن ہوگا اور رخصتی دو دن بعد انشاء اللہ!“ تاپا ابا اپنی بات ختم کر چکے تھے اور ان کے ارمان رہ کون سے گئے تھے جو وہ پورے کرتے۔ بمشکل اپنے مردہ وجود کو کھینچتے وہ اپنے اپنے کمروں تک پہنچے تھے۔

”رومی! میری شرٹ پر لیس کر دو۔“
”یہاں اترتے ہوئے علی نے بے تحاشت کہا۔

شرٹ پر لیس کر دو۔ تم رہنے دو۔ صبا اٹھو تم میری بلیو وہ اسے ٹوک کر صبا کی طرف متوجہ ہوا اور شاید پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ رومی کی موجودگی میں علی کا کام

کوئی اور کرے اور شاید کسی کو محسوس نہ ہوا لیکن رومی کو لگا تھا جیسے اس کے دل میں برچھی اتر گئی ہو۔

”زین! آج جاتے ہوئے یعنی کو بھی چھوڑ آنا اس کا پریکٹیکل ہے اور تم نے بھی آج ذرا لیٹ ہی جانا ہے۔“ چچی جان نے زین سے کہا تو وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ یہ لوگ کیوں ان سب کا امتحان لے رہے تھے۔

وہ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے تھے۔ نئے طے ہونے والے رشتوں کو کوئی بھی دل سے قبول نہ کر پایا تھا۔ بایں تو اپنے بچوں کے دل کا حال جانتی تھیں لیکن تاپا ابا جو اس گھر کے سربراہ تھے کوئی بھی ان کے آگے بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یا شاید ان کا مان نہیں توڑنا چاہتے تھے۔

دن نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہے تھے یا شاید انہیں ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ گھر میں شادیوں کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن گرجوٹی اور مسرت تو مفقود تھیں۔ وہ سب بھی تباری میں ساتھ دے رہے تھے لیکن مارے باندھے۔ یوں جسے زبردستی باندھ کر بیٹھائے گئے ہوں۔ ان کے شوخیاں اور شرارتیں جو ہمیشہ عروج پر رہتی تھیں۔ اپنی موت آپ ہی مر گئی تھیں۔ لڑکے تو گھر پہ نکتے ہی کم تھے اور لڑکیاں تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی ہنسی رہتی تھیں۔ بس کھانا پکایا، کھایا، صفائی کی اور دوبارہ اپنے اپنے کمروں میں بند۔ بڑی امی چلائی رہیں۔

”اے لڑکیو! اپنے پسند کے کپڑے ہی خرید لو، شادی پہ تو لڑکیوں کی چیزیں ہی ختم نہیں ہوتیں اور تم تو ہر وقت بیزار بھی رہتی ہو۔“

”آپ اپنی پسند سے لے لیں بڑی امی!“
ان سب کی بیزاریت اپنے عروج پہ ہوئی۔

جب دل ہی ہر قسم کے جذبات سے عاری ہو تو یہ مادی چیزیں کی کو کیا خوش پہنچا سکتی ہیں۔

بڑی امی کے دل کو بول اٹھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی ان کی۔ ان دونوں کے اربابان نہ پورے کر سکیں وہ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اس گھر میں تو ہر شخص خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ کسی انہونی کا منتظر۔

”ارے بھائی! گھر میں کوئی نہیں رہتا آج کل۔ بڑے دنوں سے محسوس کر رہا ہوں ہر طرف ایک جامد، سناٹا سا لگتا ہے۔“ تاپا ابا تھوڑی دیر پہلے ہی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

”چلیں شکر ہے آپ کو محسوس تو ہوا۔“ بڑی امی کے لہجے میں گہرا نظر تھا۔

”کیا مطلب؟“ ان کے طنز بھرے لہجے پر وہ چونک گئے۔

”اب بھی مطلب میں سمجھاؤں آپ کو۔“ بڑی امی نے شاکی نظروں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو حسنہ بیگم! وہ اب بھین میں پڑ گئے۔“

”مجھے بتائیں آپ کو اپنی اولاد سے کبھی کوئی شکایت ہوئی؟“ حسنہ بیگم نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ان کا سر بے اختیار ٹٹنی میں مل گیا۔ ان کی اولاد اپنی فرمانبرداری تھی۔

”تو پھر آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟“ وہ اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”آپ نے اپنے بچوں کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ ان کی زبانیں بے شک خاموش ہیں لیکن ان کی آنکھیں بولتی ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ

ایسے سعادت مند ہیں کہ خود ساری عمر سزا کاٹ لیں گے۔ لیکن آپ کا مان نہیں توڑیں گے۔ آپ کو ایک دفعہ بھی اپنے فیصلے پر افسوس نہیں ہوا۔“

بڑی امی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ان کا دل پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ تاپا ابا کے ذہن میں

دھماکے سے ہونے لگے۔

”کیا ان کا فیصلہ غلط تھا؟ انہوں نے تو بڑی تمکنت کے ساتھ سب کے فیصلے کیے تھے اور اپنی اس کارکردگی پر وہ نہایت شانت بھی ہو گئے اور یہ ان کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد ہی تھا کہ انہوں نے اپنی اولاد کے چہروں کی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی۔“

پھر آنے والے دنوں میں سب کچھ خود بخود ہی ان پر عیاں ہوتا چلا گیا۔ ان سب کے بیزاریت، اکتاہٹ، زبردستی کی مسکراہٹ یوں جیسے ادھار مانگی ہو۔ کسی ایک کے چہرے پر بھی خوشی کی ہلکی سی رنق نہ تھی۔ ان کا دل ڈوبنے لگتا تو

کیا مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

”ہم ٹول کے بکے لوگ ہیں اپنی باتوں سے پھرنے والے نہیں۔“ ان کی اپنی بات ہی ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

”تو کیا صرف اپنی ضد کے خاطر میں ان سب کی زندگی داؤ پر لگا سکتا ہوں؟“ وہ اپنا دل ٹٹولتے۔ دل و دماغ میں ایک جنگ سی جاری تھی۔

صبح عید تھی ہر طرف خوشی اور چراغاں کا سماں تھا لیکن نعمت کدہ میں ہر طرف سناٹا راج کر رہا تھا۔ کل شام کو ان سب کے ”کناج“ کی بھی تقریب تھی۔ لیکن یہاں خوشی کتنی تھی؟

”رومی! پچھلی عید کتنا مزہ آیا تھا ناں؟ ہم نے گائے کو مہندی بھی لگائی تھی اور خوبصورت رہن بھی باندھے تھے۔“ عینی کی آنکھوں میں چھپ چھپاؤں کے عکس بکھر رہے تھے۔

”اور کل کے دن ہی میں پہلی مرتبہ تیور سے ملی تھی۔“ صبا نے آہستگی سے کہا۔ رومی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو نجانے کہاں گم

تھی۔

”تم پھر بھی اچھی رہ جاؤ گی رومی! نہ صرف اس گھر، اس شہر بلکہ اس ملک سے ہی چلی جاؤ گی۔ کم از کم اپنوں کے سامنے خود کو کمپوز نہ کرنا پڑے گا۔ ہمیں دیکھو ہم دوہرے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ محبت نہ ملنے کا غم ہی کم نہیں ہوتا

اوپر سے سرگم کہ آپ کی وجہ سے دوسرے کی خوشیاں چھین گئیں۔“ صبا کے لہجے میں ٹوٹے کانچ جیسی چھین تھی۔

”ضروری تو نہیں ہم جیسا سوچیں حقیقت بالکل ویسی ہی ہو۔ خواب اور حقیقت دو مختلف چیزیں ہیں۔“ رومی نے افسردگی سے کہا۔

”بھئی آج گائے کو سناٹا نہیں آخر کو صبح اس کی قربانی کرنی ہے کوئی مہندی وغیرہ لگا دے اور تم لوگ اتنی چپ چاپ کیوں ہو۔ تیاری شادی کرو بھی۔ صبح عید ہے۔“ پچا جان نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تاپا ابا بھی ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔

ان تینوں کی متورم آنکھیں اور ویران سے چہرے ان سے ہرگز ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد تمام لڑکے بھی آگئے تھے۔ غالباً وہ سب عشاء کی نماز پڑھ کر آرہے تھے تاپا ابا نے بغور ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔

خاموش، چپ چاپ، مضطرب، پریشان سے۔

”تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ آج کے خطبہ میں انہوں نے مولوی صاحب کو کہتے سنا تھا۔

”قیامت کے دن مجھ سے بھی ہر ایک کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ وہاں ایسی جامد خاموشی نہ ہوگی بلکہ ہر بات کا واضح اعلان ہوگا۔ وہاں تو ہاتھ، پاؤں بھی بولیں گے پھر زبان کیونکر

خاموش رہے گی؟“ انہوں نے خود کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔

کچھ دیر وہ ان کے درمیان بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چل دیئے۔

”یار! کیا وقت رک نہیں سکتا؟“ علی مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پچا جان بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ لڑکیاں تو انہیں دیکھتے ہی چلی گئی تھیں۔ گھر میں رونق اور چہل پہل نام کو نہیں تھی۔

”کاش کہ وقت رک سکتا تو میں اپنی ساری زندگی آج کی رات ہی جی لیتا۔“ علی بے چینی سے ادھر ادھر ٹپکنے لگا۔

”بیٹھ جاؤ علی! کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہو؟“ زین نے اپنائیت سے کہا۔

کتنا شوق تھا زین کو ان سب کے ساتھ عید منانے کا۔ لیکن آج وہ ان کے ساتھ بھی تھا تو کس طرح؟ صبح اس کا نکاح تھا اس کے والدین نے صبح آنا تھا جب کہ زین یہیں رک گیا تھا۔

صفی اور شہزادان کی حالت دیکھ دیکھ کر دکھ کے اتھاہ سند میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ کاش کہ وہ ان کی خاطر کچھ کر سکتے۔ وہ تو صرف اللہ سے دعا ہی کر سکتے تھے اور یہ کام پچھلے کئی دنوں سے وہ بڑے زور و شور کے ساتھ کر رہے تھے۔ شاید ان کی کوئی دعا ہی رنگ لے آئی۔ لیکن ایسی کوئی صورت تو فی الحال نظر نہیں آرہی تھی۔ علی اور زین اگر اپنی قسمت سے شاکی ہے تو صفی اور شہزادان کے دکھ میں برابر کے شریک تھے۔

میرے دل میرے مسافر ہوا دھرے حکم صادر کہ ہوں وطن بدر ہم تم دیں گلی صدا میں کریں رخ نگر نگر کا کر سرخ کوئی پائیں

کسی ہار نامہ برکا
ہراک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کوئے خاموشیاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ
کیا ہے؟
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شاعر ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

دکھ وہ سنائیں کسی کو اپنا دلہنیں روتی ہوئیں
صحن میں بکھری ہوئی جن کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئیں
ہجر کا الاؤ ہو یا گھر کا ہو چوہا کوئی
دونوں طرف ہی آگ ہے اور لڑکیاں جلتی ہوئیں
مرد حضرات عید نماز پڑھنے گئے تھے جب
کہ خواتین گھر کا پھیلا واسیٹ رہی تھیں۔ صبح
سے رشتہ داروں کے فون آنا شروع ہو گئے تھے
کہ شام کو وہ سب تقریب میں پہنچ جائیں گے عید
کی وجہ سے کوئی بھی پہلے نہیں آ سکا تھا۔
پھپھو وغیرہ کی پٹنیں کنفرم نہیں ہوئی تھیں
لہذا طے یہ پایا تھا کہ رومی اور ہمالیوں کا نکاح فون
پر ہی ہو گا۔ پھپھو جلد از جلد پاکستان پہنچنے کی
کوشش میں تھی۔ ان کے پاکستان پہنچنے پر ہی
رخصتی کا پروگرام تھا۔

تایا ابا عید گاہ سے باہر نکلے۔ موسم نہایت
خوشگوار تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف
دیکھا۔
”اے میرے اللہ! مجھے درست فیصلہ

کرنے کی توفیق عطا فرما۔“ نظریں جھکائے
ہوئے انہوں نے ”آمین“ کہا تھا اور فیصلہ تو وہ
کر چکے تھے لہذا شانت سے ہو کر گھر کی طرف
چل پڑے۔

”پھر کیا خیال ہے تم لوگوں کا۔ قربانی خود
ہی کر لو گے یا پھر کسی قصاب کو بلاؤں۔“
وہ سب عید نماز پڑھ کر گھر آ چکے تھے۔ تایا
ابانے انہوں سے پوچھا۔

”نہیں تایا ابا! قربانی ہم اپنے ہاتھوں سے
کریں گے کم از کم سال بعد ایک نیکی ہی سہی۔
شاید یہی کام آ جائے۔“ صفی کے چہرے پر
سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی البتہ آخری جملہ اس
نے دل میں ہی کہا تھا۔

”حسنہ نیگم! ذرا لڑکیوں کو تو بلاؤ عیدی تو
دے لوں انہیں۔“ تایا ابا کے کہنے پر وہ تینوں
ناچار لاؤنج میں آئی تھیں۔ بلکہ زبردستی کی
مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ”عید مبارک“ بھی کہا
تھا۔

تایا ابا کھڑے ہوئے باری باری ان تینوں
کو پیار دیا۔ تمام لڑکوں کو گلے لگایا۔ ان کی
آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”مجھے اپنی اولاد پر فخر ہے خدا ایسی
فرمانبردار اولاد سب کو دے۔ میں اپنے غلط فیصلے
سے بہت سی زندگیاں اجاڑنے جا رہا تھا لیکن خدا
کا شکر ہے جس نے مجھے بروقت رخ راستہ دکھا
دیا۔ خاتم سب کو دائی خوشیاں دیے۔“ تایا ابا کی
باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں وہ سب
ہونفوں کی طرح آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے
انہیں دیکھ رہے تھے۔

بقبرہ عید کی شام ”نعمت کدہ“ میں اپنی تمار
خو بصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی تھی۔
رومی کے پہلو میں علی، زین کے پہلو میں

یعنی جب کہ صبا کا پہلو خالی تھا۔ اس لئے وہ بے
چینی سے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ رات تیزی
کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ ہر طرف رونق اور گہما
گہمی تھی۔ سب کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑ
رہی تھی۔

سندس آپی کے والدین انہیں عید ملنے آئے
تھے۔ تایا ابا نے ان سے صبا کے رشتے کی بات کی
وہ تو پہلے ہی دو دفعہ دست سوال پھیلا چکے تھے۔
نوراً خوشی سے راضی ہو گئی۔ لیکن تیمور کا پتہ نہیں
چل رہا تھا۔ وہ دوپہر سے گھر سے غائب تھا۔
موبائل بھی آف تھا۔ بڑی امی کا اصرار تھا کہ
تینوں نکاح ایک ساتھ کیئے جائیں اور تیمور کی وجہ
سے وہ رکے ہوئے تھے۔ وہ بے چارہ تو
صورتحال سے یکسر لاعلم نجانے کہاں کی خاک
چھان رہا تھا۔

”کہاں مرے ہوئے ہو تم۔ دوپہر سے نمبر
پش کر کر کے میری انگلیاں کھس گئی ہیں۔“ بالآخر
سندس آپی کی کال مل گئی تھی۔ وہ بری طرح
گرہیں۔

”دراصل میں ایک.....“ سندس آپی نے
اس کی بات کاٹ دی۔

”جہاں کہیں بھی ہو پندرہ منٹ کے اندر
اند ”نعمت کدہ“ پہنچ جاؤ تمہاری وجہ سے پہلے ہی
بہت دیر ہو چکی ہے۔“ اس کی بات نے بغیر
انہوں نے فون بند کیا۔

تیمور بکا رہ گیا بہر حال پندرہ منٹ تک
وہ واقعی نعمت کدہ پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ
صورتحال سمجھتا۔ صفی بھناتا ہوا آیا تھا اور بکرے کی
طرح اسے کھینٹے ہوئے صبا کے برابر والی چیز پہ
بٹھا دیا۔

”چلیں مولوی صاحب شروع کریں۔“ چچا
جان نے کہا تو مولوی صاحب نے خاصی مشکوک
نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا۔ آف دہائیٹ

سی شرٹ جو پہنتے وقت یقیناً دہائیٹ تھی۔ بیلو
ٹراؤز، پاؤں میں عام سے سلیپر، بکھرے اچھے
بال وہ کہیں سے بھی دو لہانیں لگ رہا تھا۔

”نعمت تم یہ مہربان ہو گئی ہے تیمور!“
سندس آپی نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر سرگوشی
کی۔ اس نے ایک نظر اپنے ساتھ سٹے سٹائے
وجود پہ ڈالی اور اس کا دل خوشی اور تشکر کے بے
تحاشا احساس سے لبریز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی
مبارک سلامت کا شور ان کے کانوں میں گونج رہا
تھا۔

تایا ابا کا ارادہ تو صرف نکاح کا تھا لیکن
تیمور کے گھر والے رخصتی پہ زور دے رہے تھے۔
ان کے اتنے اصرار پر وہ انکار نہ کر سکے تو پھر علی
اور زین کیوں پیچھے رہتے۔

رات کالی ہو چکی تھی لہذا صبا کو سندس آپی
کے گھر ہی لے جایا گیا تھا۔

”آہم۔“ تیمور اس کے بے حد قریب بیٹھ
چکا تھا صاف توڑا پیچھے سرک گئی وہ نہ صرف مزید
قریب ہو گیا بلکہ اپنا دایاں بازو بھی اس کے گرد
پھیلا دیا۔

”پیچھے نہیں۔“ صبا نے اسے دھکیلا۔

”اپنی گوشت کی شمل آ رہی ہے کیا سارا
دن بکروں کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہے
ہیں۔“ وہ اپنا دلوہنا یکسر فراموش کر چکی تھی۔

”بس یار! تمہیں پتہ تو ہے آج کے دن
قصائیوں کی کتنی قلت ہے۔“ اس نے سرکھایا۔

”تو کیا سارا دن قصاب کا رول پلے کرتے
رہے ہیں؟“ صبا نے آنکھیں پھاڑیں۔ تیمور کا
قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”آج کے دن تو رحم کر لو۔ آتے ہی لڑاکا
بیویوں کی طرح شروع ہو گئی ہو۔“ تیمور کا لہجہ آج
دینے لگا تھا۔ صبا کی پللیں بے ساختہ جھک گئیں۔

زمین کمرے میں داخل ہوا تو یعنی کو زارہ قطار روٹے دیکھ کر بھونچا رہ گیا۔

”کیا ہوا یعنی؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ لپک کر

اس کے پاس آیا۔

”چنگر کے رخصتی کر دی میری، میں نے کہا

بھی تھا ابھی نہیں، نہ مجھے کچھ پکانا آتا ہے اور

تمہیں تو پتہ ہے ہاں زمین! مجھے کام سے سخت

نفرت ہے۔“ بھل بھل بھتے آنسوؤں کے ساتھ

وہ اپنی ازلی سادگی سے گویا تھی۔ زمین بے ساختہ

مسکرا دیا۔

”کام سے بے شک نفرت کرو لیکن مجھ

سے تو محبت کرو گی ناں۔“ ایک ہاتھ سے اس کے

آنسو پونچھتے ہوئے اس نے گھمبیر لہجے میں کہا تو

یعنی کو ایک دم اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔ اس

نے گڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ دل الگ زور زور سے

دھڑکنے لگا تھا۔

”تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔“

اس کی طرف جھکاؤ پونچھ رہا تھا۔ یعنی کے چہرے

پہنچا اور مسکراہٹ بکھر گئی اور زمین کو اپنے تمام

سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔

”تم پہلے میری منہ دکھائی نکالو باقی باتیں

بعد میں بگھارنا۔“ ادھر روی اور علی کا آج بھی اپنا

ہی جھگڑا تھا۔

”یقین کرو روی! اس وقت میرے پاس

ایک روپیہ تک نہیں ہے؟“ علی کے لہجے میں

شرارت تھی۔

”شادی کروانے کا پتہ تھا رو نمائی کے لئے

گفٹ خریدنے کا پتہ نہیں تھا۔“ اس نے چلتے

عورتوں کی طرح ہاتھ نیچا کر کہا۔

”اوہ..... پس۔“ وہ جوش سے اٹھا اور اسٹڈی

روم میں گھس گیا تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو اس کے

ہاتھ میں ڈھیر ساری کاجی کی چوڑیاں تھیں۔

چوڑیاں لانے کا کیا تھا۔ چوڑیاں تو میں اسی دن

لے آیا تھا۔ لیکن تمہیں چڑانے کے لئے میں

تمہیں دی نہیں تھیں۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ایسے

کڑے وقت میں یہ میرے کام آئیں گیں۔“

چوڑیاں اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے اسے بنا

رہا تھا۔

”علی! اگر تم چوڑیاں خرید ہی لائے تھے تو

مجھے دینے میں کیا قہاحت تھی؟“ وہ کچھ حلقی سے

پوچھ رہی تھی۔

”اب بھی تو تمہیں ہی دے رہا ہوں ویسے

اگر مجھے سب سے معلوم ہوتا کہ تمہاری شادی مجھ سے

ہوتی ہے تو میں بڑا زبردست سا گفٹ خریدتا۔“

وہ چوڑیاں اسے پہنا چکا تھا۔

”قدر خلوص کی ہوتی ہے قیمت کی نہیں۔“ اپنی

کلائی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

”اور میری طرف سے اس خلوص میں ہمیشہ

اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔“ اس نے گویا اسے یقین

دلایا تھا۔

”ویسے میڈم! آپ کی رونمائی تو آپ کو مل

گئی ہے اگر اجازت ہو تو تھوڑا روٹاں بگھار

لوں۔“ دنیا بھر کی شرارتیں اس کے لہجے کا حصہ

بنی ہوئی تھیں۔

”دیکھو علی! تم کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں

کرو گے۔“ وہ اس کی کلائی تمام چکا تھا۔ روی

کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

”اوکے پر اس الٹی کوئی حرکت نہیں کروں

کا ساری سیدھی حرکتیں کروں گا۔“ اسکا انداز ہنوز

برقرار تھا۔

”تو پھر پہلے بندروں کی طرح گھورتا بند

کرو۔“ وہ فوراً بولی تو بے اختیار علی کا قبضہ گونج

اٹھا جس میں روی کی شرابی مسکان بھی شامل

تھی۔

☆☆☆